تصوّراتِ اقبال

مُصنّفہ

شاغلِ فخری

نفیس اکیڈمی
عابد روڈ حیدرآباد دکن

قیمت تین روپیہ پندرہ آنہ سکہ عثمانیہ
قیمت تین روپیہ چھ آنہ کلدار

طبع اوّل ——— ایک ہزار

اعظم اسٹیم پریس حیدرآباد دکن

فہرست

شاغل فخری کی اِس عقیدت بھری
تالیف کو ان کی عقیدت کے مرکز اور
اِس تالیف کی روح رواں قرآن مجید
ہی سے معنون کرتا ہوں ۔

عمران انصاری

عمران انصاری

دو دو باتیں!

فخری کے بعد یہ اُن کی پہلی تصنیف ہے جو منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ اُن کے اپنے زمانہ میں جو تصانیف شائع ہو چکی ہیں، ان میں تعارف نگاری اسلئے ضروری نہ سمجھی گئی کہ سوسائٹی کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ ہم میں شامل تھے اور آئے دن کے ادبی مشاغل کی بنا پر وہ آسانی سے پہچان لئے جاتے تھے۔ لیکن اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں، ان کا وہ کردار جو اتنی سی عمر میں ان کو ایک بلند پایہ ادیب بنا سکا بطور "قصۂ پارینہ" کے نہیں بطور "نشانِ منزل" کے متعین کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے ——

"تا حتی المقدور ان سطور کی تیاری محض ناقد کے دماغ سے کر رہا ہوں، پھر بھی اگر والہانہ و برادرانہ جذبات کہیں سے پھوٹ نکلیں تو اتنی دیر کے لئے آپ بھی اپنے سینہ میں ایک ماتم گسار دل برپا کر لیجئیگا۔ یہ تو محض قانونِ فطرت اور طویل قربت و قرابت کی وجہ ہے کہ یہ فرض آج میرے ذمہ ہے ورنہ اگر اس "مردِ قلندر" کی زندگی نے صرف اس قدر وفا کی ہوتی کہ وہ آئندہ جو کچھ لکھنا چاہتا تھا یا وہ پسماندہ تصانیف جو ابھی طباعت و اشاعت کی منزلوں سے نہیں گذری ہیں —— ادبی حلقوں میں

پہنچ گئی ہوتیں تو اس وقت ہم میں کا ہر فرد، مثل راشد الخیری کے صادق ــــــــ اقبال کے جاوید ــــــ اور عظیم بیگ کی قائم کے ہوتا ــــــــــ ایسے منفرد اہل قلم حضرات کہ ہم اپنے دل میں خون جگر کا سا مرتبہ دینے کے لئے فطری طور پر مجبور رہیں اپنی حیات تک یہ مخصوص نا توں رشتوں کو مدد دیتے رہے ہوں گے۔ لیکن اب ان کے رشتے نامحدود ہیں۔ اور یہ محلوں، شہروں اور خاندانوں کی حدود سے متجاوز ہو کر بین الاقوامی و بین الملی سرحدوں میں داخل ہو چکے ہیں ــــــ اب وہ ہمارے بیٹے بھی ہیں، باپ بھی بہنیں بھی اور بھائی بھی ــــــــ

خدا ان کو کروٹ کروٹ چین دے!

یہ دبلا پتلا، پھرتیلا و شرمیلا، قہقہہ ریز و حسرت بیز، پر شباب و پر مشیب اہل قلم جب فطرت کی تمام منزلیں طے کر کے دامن مادر میں آیا تو افلاس و نکبت، یاس و قنوطیت، بے مائگی و بے چارگی، ناکامی و نامرادی کا تھتھری دیوتا سرہانے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اس کی آغوش سے لیکر جو اس نے سینہ سے لگایا تو واپسی کی تمام منزلوں تک آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیا ــــــ یہ ایک ایسی جانگداز داستان ہے جس سے ہندوستان کے بیشتر گھرانے عملاً بخوبی واقف ہیں ــــــ اور ہمارے اعاظم الرجال ایسے ہی ماحول میں پل بڑھ کر کچھ کر بھی گئے ہیں، ورنہ فراغت نصیبوں کی جرأتیں معلوم ــــــــ!

میں اس بحث میں ہرگز نہ پڑتا اگر مصلحت یہ مدنظر نہ ہوتی کہ نجانے کتنے گھرانے اب بھی ایسے ہی لعل و جواہر اپنی گودڑیوں میں لئے پڑے ہوں گے اور ایک دن افلاس و تنگدستی، گمنامی و نامرادی ان کا گلا نہ گھونٹ دیگی۔ ہو سکتا ہے کہ ہم بہت عرصہ تک اس قسم کے "قومی نقصان" کو برداشت کرتے رہیں اور زبان سے

اف نہ نکلے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ بار بار "سینہ" کے ان "داغوں" کو ہر ہر زاویئے سے محسوس کرتے رہتے اور دہراتے رہنے سے پورا ماحول، سارا سماج اور یہ کل زمین وآسمان ایک جھرجھری لے اور ابتلا و بربادی کے ایک ایک محرک کو چن چن کر نیست و نابود کر دے ———

کاش وہ وقت آئے اور جلد!

اس تذکرہ کے ذیل میں ایک اور حقیقت قابل لحاظ ہے کہ ثانیاً وہ بھی اس تعارف نگاری کا باعث ہے ——— یعنی قوم کا دامن کبھی مصلحین سے خالی رہا نہ اب ہے۔ پھر بھی اصلاح و ترقی کی رفتار کچھ زیادہ امید افزا نہیں ——— دراصل اس راہ میں وہی حضرات زیادہ مستعد نظر آئیں گے جو اپنی زندگی کا پر شباب و پر جذبات دور گذار چکے ہیں۔ اور ان کی ہر خواہش اصلاح "بلی کے حج" سے کسی طرح بہتر نہیں۔ اپنی زندگی تو وہ بالکل انھیں راہوں پر گزار چکتے ہیں، جس سے دور رہنے کی وہ آج تاکید کر رہے ہیں کیونکہ اب ان پر کہولت و کبنیت سوار ہے۔ اور وہ تنوع پسند دل اور وہ رنگینوں میں غوطے کھانے والا دماغ پیچھے رہ گیا ہے۔ لیکن ٹھیک اسی ماحول میں اپنے ماسبق طبقہ کو نہیں دیکھ سکتے ——— بنابریں وہ علیگڈھ یافتہ گروہ یا وہ مغرب پرست "بھیڑچال"، جو تنوع و رنگینی میں ان سے کہیں آگے ہے اور جن کا نوجوان خون اب رگوں سے باہر فراٹے بھرتا فضاؤں، ہواؤں، کلکدوں اور چمن زاروں میں ڈال ڈال اور پات پات جھولتا پھرتا ہے، اس کو اس جانب کیوں توفیق ہونے لگی ——— و برخلاف اس کے ان میں استہزاء و تمسخر کی صلاحیتیں بیدا رہوتی ہیں جو اصلاح و ترقی کا وعظ سننے سے قبل تک نہ تھیں ——— گویا اس طریقۂ اصلاح سے وہ گمراہ طبقہ ایک آدھ قدم آگے بڑھنے کے اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا!

لیکن وہ مصلحین نسبتاً کامیاب ہیں اور الحاد و انکار کے نمایندوں پر ان کا خاطرخواہ اثر ہے جو خود بھی نوجوان ہیں اور تہذیب جدید کے پروردہ ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیب جدید کی رگ حیات منقطع کرنا اپنا مقصد بنا چکے ہیں ــــــ اگر مصلح و اصلاح مند طبقات کو آمنے سامنے کھڑا کر دیا جائے تو باعتبار ظواہر ان کی تقسیم و علیحدگی آسان نہیں، دونوں ایک ہی لباس، ایک ہی صورت اور ایک ہی دل و دماغ کے حامل ہیں مگر کردار باطنی میں زمین و آسمان کا سا فرق ہے ــــــ ان کے بھی سینے شرر آباد ہیں، ان کے بازو بھی زور آزمائی کے لئے پر تولتے رہتے ہیں اور ان کے ہونٹ بھی ہر ہر گل و بوٹے کا رس لینا جانتے ہیں۔ لیکن وہ نہ صرف یہ کہ ایسا نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف وہ کسی نور ہدایت کی سرکار میں عہد کر چکے ہیں کہ دوسروں کو بھی ایسا کرنے سے باز رکھیں گے ــــــ جو خود نفس کشی کر سکتے ہیں، وہ دوسروں کی نفس پرستی پر موثر طعن کر سکتے ہیں اور جو نفس کی دست برد سے بہت آگے نکل گئے ہیں وہ اس مثال سے کچھ زیادہ مختلف نہیں کہ :-

گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر !

مخزی تہذیب جدید کی بہترین پیداوار اور تہذیب جدید کا بہترین نقاد تھا۔ وہ تہذیب اسلامی کا زبردست حامی اور اسلام و قرآن کا ایسا والہ و شیدا تھا کہ یہی باعث ہے جو اس کی نگاہ صرف اقبال پر آ کر ٹھہر جاتی تھی اور اس کے کلام کو سن سن کر جھوم جھوم اٹھتا تھا۔ جس طرح کہ اس کی کتابیں رٹی اور ازبر کی ہوئی ہیں اس طرح اس نے اقبال کے ایک ایک مصرعہ سمجھا اور بوجھا تھا ــــــ وہ جس طرح حافظ قرآن تھا اس طرح حافظ اقبال بھی ــــــ

لیکن اس کو نام نہاد "مولویت" و "ملائیت" سے سخت بیر تھا۔ اگرچہ اس کا
گھرانہ اس تعریف سے بہت بلند ہے، لیکن پھر بھی بعض امور میں نکتہ چیں نظر آتا ہے
اپنی ایک تحریر میں لکھتے ہیں :۔

" میرا ماحول نہایت سخت قسم کا مذہبی ماحول تھا، میرے والد سیدی و مولائی
حضرت پیر ابو احمد صاحب قدس سرہٗ العزیز کے خاندان مجددیہ و نقشبندیہ میں بیعت
تہجد گذار، پابند صوم و صلوٰۃ لباس معاشرت، وضع قطع، بات چیت، غیظ و غضب
ہر چیز مولویانہ ـــــــ والدۂ مرحومہ سے میں نے یہ قصہ سنا تھا کہ جب میں پیدا
ہوا تو صبح کا وقت تھا، والد اشراق کی نماز سے فارغ ہو کر درود وظائف کا ورد
کرتے ہوئے مسجد سے گھر میں آئے اور مجھے گود میں لیکر درود وظائف کا دم کیا اور
ذرا پیشانی پر بل ڈال کر بولے :۔

" دیکھو صاحبزادے ! اگر تم نیک و صالح ہو، میرے نقش
قدم پر چلنے والے ہو، مذہب اور اس کے ہر ہر جزو کو زندگی
کے ہر ہر شعبہ میں مقدم رکھنے والے ہو تو جینا ورنہ میری دعا
ہے کہ تم اسی وقت مر جاؤ، کان کھول کر سن لو ـــــــ
تمہاری آنکھ قرآن عظیم پر نثار ہونے والی ہوگی، تمہارے
کان وقف ہوں گے اور تمہارے ہاتھ پاؤں خدمت خلق
کے مقصد کے لئے ـــــــ اور اگر تم مجھے بتا دو کہ ایسا
نہ کر سکو گے تو سمجھ لو کہ میرے ہاتھ اسی وقت تمہاری زندگی
کا رشتہ منقطع کرنے کے لئے تیار ہیں ـــــــ "

دوسری جگہ لکھتے ہیں :۔

میری تربیت والد صاحب کے عین منشا کے مطابق ہوئی اور خاص طور پر

سب سے پہلے قرآن حفظ کرایا گیا۔ لیکن اب میں غور کرتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے لئے وہ وقت مناسب نہ تھا۔ کیونکہ قرآن کی جیسی عظمت ہونی چاہیئے اس عمر میں نہیں ہو سکتی ——————

اصولاً تو مجھے سخت قسم کا "مولوی" ہونا چاہیئے تھا مگر

"مولویت" سے شروع ہی سے مجھے لگاؤ نہ رہا۔

زخاک کمہ ابوجہل ایں چہ بوالعجبی ست!

مذہبی اُمور میں ابتداءً میں بہت لاپرواہ رہا اور اب بھی کسی نیکی یا اچھی بات کو اس لئے قبول نہیں کرنا چاہتا کہ یہ مذہب کی طرف سے آئی ہے بلکہ اچھی اور نیک بات وہ ہے جو عقل وانسانیت کے نزدیک اچھی اور نیک ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجھ میں جو کچھ بھی عمدہ اخلاق ہیں، ان کا اجر مجھے کچھ بھی نہ ملیگا، کیونکہ دغا و فریب، زنا و دروغ سے میں اس لئے متنفر نہیں کہ مذہب اس کی ممانعت کرتا ہے بلکہ اسلئے کہ انسانی اخلاق وضمیر ان سے گریزاں ہیں۔

لوگوں نے جس چیز کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے میرے نزدیک وہ نہ دلِ ہیں اصل ہیں، میں نے امکانی حد تک مذہبی تواریخ کا مطالعہ کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ انسان کا نماز روزہ اور احکام شرعیہ کی پوری پابندی محض بیکار رہے اگر اس سے کوئی اجتماعی فائدہ نہو۔ دنیا کے لئے اس سے زیادہ کوئی لعنت نہیں کہ ایک شخص "مولوی" بن کر ہمدردی بنی نوع کا سبق بھول جائے، دوسروں کے لئے باعث بوجھ اور باعث تکلیف ہو۔ میں جانتا ہوں کہ مذہب برائی سے روکتا اور بھلائی کی تلقین کرتا ہے لیکن لوگوں کی زیادہ تعداد نے اسی غلو میں برائیاں ہی حاصل کیں۔"

یہ صحیح ہے کہ باپ کی خواہشات کو اس نے لفظاً پورا نہ کیا لیکن معناً

کوئی کسر اٹھا نہ رکھی، اس نے اپنے دل و دماغ کو اس درجہ صاف کر لیا کہ قدامت کے خس و خاشاک اس کی قوت فکر سے صاف ہوتے چلے گئے اور یہی باعث ہے کہ مذہب کے صاف و ستھرے مفہوم کو وہ عملی جامہ پہنا سکا جس سے اس دور کے لئے راہ عمل متعین ہوتی ہے۔

آیندہ سطور میں بیشتر اسی کی تحریر کے حوالے دونگا کہ جو اپنا آپ تعارف ہیں۔ اس کی صحیح زندگی منشی فاضل کے امتحان میں ناکام ہونے کے بعد شروع ہوتی ہے۔ اس وقت اس کے قوا نزور بار ــــ تے ہیں اور جھنجھلا جھنجھلا کر تمدن و معاشرت کے ایک ایک جزو پر ناقدانہ نظر ڈالتا ہے پہلے اس کا خانگی ماحول دیکھئے:ــــــ

"تمام دن کا تھکا ہوا دماغ لیکر رات کو ساڑھے آٹھ بجے مطالعہ کے لئے کتاب لیکر بیٹھا، ابھی پورا ایک صفحہ بھی نہ دیکھا تھا کہ:۔

"شامت اعمال ما صورت نادر گرفت"

والد صاحب کی رگ تقریر پھڑکی، میں جس قدر اپنے دماغ کو اس طرف سے ہٹا کر زیادہ غور سے کتاب میں نظریں گاڑ دیتا، اتنا ہی اس طرف تقریر میں زور بڑھتا جاتا۔ مسلسل دو گھنٹے یہی کشمکش جاری رہی۔ آخر مجبوراً ساڑھے دس بجے کتاب بند کر دی۔ اور اس عزم کے ساتھ پلنگ پر جا لیٹا کہ آج دیکھیں کہنے والی زبان زیادہ طاقت ور ہے۔ یا سننے والے کان ــــــ مگر اس کا کیا علاج کہ:ــــــ

"وہی سو گئے داستاں کہتے کہتے"

دراصل فخری کے والد اپنی گوناگوں پریشانیوں، کاروبار کے سقوط اور

جائداد کے رفتہ رفتہ ختم ہو جانے کے صدموں سے مخبوط الحواس سے ہو گئے تھے۔ چونکہ اب ان کے زیر اثر ٹھیکہ داروں کے سینکڑوں آدمیوں کے بجائے صرف ان کا اپنا ہی بیٹا باقی رہ گیا تھا اس لئے سارا غم و غصہ اسی پر اتارتے رہتے تھے۔ اور اس احتیاط کو بھی کبھی خاطر میں نہ لاتے تھے کہ وہ غریب دفتر کی گھس گھس، درس و تدریس اور خانگی مطالعہ میں اگر پورا وقت نہ دیا کرے تو آیندہ تعلیم کس طرح جاری رہ سکیگی ــــــ چنانچہ دوسری جگہ لکھتا ہے:۔

"آہ! ــــــ آج مدت کے بعد یہ موقع نصیب ہوا تھا کہ میں گھر میں تنہا وقت گذار سکوں! تنہائی مجھے بہت مرغوب ہے۔ میں تنہا رہ کر بہت کچھ کر سکتا ہوں، خلوت میں میرے دل کے ساز بجنے لگتے ہیں۔ مجھے جو روحانی مسرت سب سے جدا، بالکل الگ، خاموش زندگی میں حاصل ہوتی ہے وہ کسی اور طریقہ پر ممکن نہیں۔ جب تک عورتیں گھر میں تھیں ہر طرف چہل پہل تھی لیکن والد صاحب کی بات بات پر نکتہ چینیاں زندگی کو بدمزہ کئے ہوئے تھیں۔ لیکن آج عورتیں شہر چلی گئیں، والد صاحب، والد صاحب بھی کہیں چلے گئے گھر میں کوئی نہ تھا بارش بھی ہو رہی تھی، میں نہیں بیان کر سکتا کہ جو مسرت و ٹھنڈک میری روح نے حاصل کی۔ فرط جذبات سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ جب سے مکان کا پچھلا حصہ فروخت ہوا ہے آج یہ پہلا دن تھا کہ میں گھر میں سکون اور آزادی کے ساتھ سانس لے رہا تھا ــــــ

میں لوگوں سے بھی ملتا ہوں لیکن اس حالت میں کہ گھر کی فضا میرے موافق نہیں ہوتی۔ مگر اب ایسی حالت میں کہ میں تنہا ہوں کوئی مجھے اس روحانی فضا سے نکالنا بھی چاہے تو میں ہرگز نہ جاؤں خواہ ترغیب و تہدید کتنی ہی شدید کیوں نہ ہو ــــــ میں دالان میں مسرور دل کے ساتھ بیٹھا گنگناتے ہوئے بارش

سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ پانی بھرنے بھشتی آگیا ـــــــ بے چارہ بہت غریب ہے، اس کے ماں باپ بھی ہمارے یہاں پانی بھرتے تھے، گھر میں کسی کے نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی میرے پاس بیٹھ گیا۔ پانی بھی کچھ تیز ہو گیا تھا، اس کی دکھ بھری کہانی سن کر اپنا سارا دکھ بھول گیا۔ غریب کے پاس کپڑے بھی سالم نہ تھے، میں نے اپنے دو جوڑے اور ایک ٹوپی اس کو دی، بہت خوش ہوا، اس کی خوشی دیکھ کر مجھے بھی سچی خوشی حاصل ہوئی۔ میرے لئے وہ وقت سب سے زیادہ مسرت و فرحت کا ہوتا ہے جب میں کسی کے ساتھ کوئی سلوک کروں اور وہ خوش ہو جائے ایسی جو لذت میرا دل پاتا ہے وہ دنیا کی کسی بڑی سے بڑی تفریح میں بھی مجھ کو حاصل نہیں ہوتی ـــــــ کاش میں اس قابل ہوتا اور رب مجھے اتنی توفیق ہوتی کہ رات دن لاتعداد لوگوں کی امداد کر کے ان کو خوش ہوتا ہوا دیکھ کر خود بھی سچی مسرت حاصل کرتا رہتا۔ اول تو ایسا اتفاق کم ہوتا ہے کہ میں کسی حاجت مند کی حاجت روائی کروں اور جب ایسے مواقع آجاتے ہیں اور رب مجھے اس کی توفیق نصیب ہوتی ہے تو میں یہ خوب سمجھتا ہوں کہ میرا یہ کام خدا کے یہاں کبھی مقبول نہیں ہو سکتا۔ اس میں للہیت نہیں ہوتی، بلکہ یہ بھی میرے قلبی مسرت کے حصول کا ایک ذریعہ ہے جو حاصل ہو جاتی ہے ـــــــ لوگ دوسرے طریقوں سے سچی مسرت حاصل کرتے ہیں، میں نے سچی مسرت کے حصول کا یہ طریقہ ڈھونڈا ہے ـــــــ پھر اس میں للہیت کہاں رہی ـــــــ و اس لئے اجر کی امید ہی فضول ہے ـــــــ خدا واسطہ کوئی کام کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ سعادت ہر شخص کے حصہ میں نہیں آتی۔ دنیا والوں کے نزدیک یہ نیکی ہو، مگر میرے نزدیک یہ نفسانیت ہے ـــــــ نیکی میں نفسانیت کہاں ہوتی ہے اور یہاں دل کو جو مسرت حاصل ہوتی ہے اسی کا نام نفسانیت ہے۔ خدا کے

یہاں ایسی عبادت مقبول نہیں، وہ خوب جانتا ہے جو کچھ ہم کرتے ہیں اور جو کچھ ہمارے دلوں میں ہے"۔

کچھ دن بعد والد بیمار ہوگئے اور اس بیماری میں گھر کی جو حالت ہوگئی اس کے ہدف آج کتنے گھرانے نہ ہوں گے؟ —:

"لوگ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن و سکون کی جگہ گھر ہے، لیکن یہی جگہ میرے لئے سب سے زیادہ سوہانِ روح ہے۔ والد بیمار ہیں، رات دن گھر میں رہتے ہیں، غصہ خفگی، نکتہ چینی کے سوا کچھ کام نہیں۔ یہ وہ ابتلا ہے جس کا کوئی مداوا نہیں۔ جب سے گھر کا آدھا حصہ فروخت ہوا ہے، میرے لئے یہ جگہ جہنم سے بدتر ہوگئی ہے۔ ایک کمرہ ایک دالان ہے، دالان میں چولہا اور والد کا پلنگ ہے۔ کمرہ میں گھر کی کل کائنات اور میری کتابیں بھی —— اس ٹھونسم ٹھانس میں میری بیشتر چیزیں خراب ہوتی جا رہی ہیں —— نہ سونے کو جگہ نہ بیٹھنے کو ٹھکانہ! خدا معلوم یہ مصیبت کے دن کب ختم ہوں گے!!"

یہ بدمزگیاں جیسی کچھ ہیں، کچھ دردمند دل ہی خوب سمجھ سکتے ہیں لیکن دکھانا مقصود یہ ہے کہ انسانیت کی تخلیق ان حالات میں ہی کچھ بہتر ہوا کرتی ہے —— مگر ستم بالائے ستم یہ ہے کہ غریب پڑھ بھی رہا ہے اور اپنے کنبہ کی پرورش کے لئے نوکری و مزدوری بھی ساتھ کر رہا ہے۔ فطرت کی عطا کردہ صلاحیتیں ادنیٰ درجہ پر جینے، جانوروں کی طرح کھا پی کر پڑ رہنے سے باز رکھ رہی ہیں اور معاشی حلقے گردن دابے ہوئے ہیں۔

"افسوس گھر کی بدنظمی، حالت کی ابتری، جگہ کی تنگی اور دفتر کی بیہودہ مصروفیتیں میرے مطالعہ و کتب بینی کو غارت کئے دیتی ہیں ایک تو یونہی پڑھنے کو کم وقت ملتا ہے اس پر مستقل یہ روکاوٹیں —— ؟ اگر تھوڑا

بہت وقت نکال کر پڑھتا ہوں تو یکایک کسی مصیبت کے نازل ہو جانے کے اندیشہ سے بعض اوقات خواہ مخواہ کانپ کر رہ جاتا ہوں کیونکہ ان کی آمد کا کوئی وقت مقرر نہیں البتہ اس وقت ضرور جبکہ میں دل لگا کر مطالعہ کر رہا ہوتا ہوں —— کیا کروں —— کیا نہ کروں؟ —— ملازمت بلائے جان بنی ہوئی ہے، مزدوروں میں نام لکھا ہے اور وہ بھی غیر مستقل، سارا وقت تباہ ہوا جاتا ہے انھی ملازمت کے پندرہ روپیوں پر پانچ چھ ہستیوں کی زندگی کے دن پورے ہو رہے ہیں ——

کمرہ میں صرف ایک چارپائی میرے لئے مخصوص ہے۔ اس کے اوپر ایک الگنی ہے، جس پر میرے کپڑے لٹکتے ہیں۔ اسی پر کتابیں اور نوشت و خواند کا سامان پڑا رہتا ہے۔ یہی چارپائی میری خوابگاہ ہے، یہی ڈرائنگ روم یہی مطالعہ کی نشست اور یہی ڈائننگ ہال —— غرض جو کچھ ہے میری کل کائنات یہی چارپائی ہے۔ پھر اسی کمرہ میں گھر کا کل سامان، جلانیکی لکڑیاں، صندوق اور برتن، کپڑے اور خدا جانے کیا کیا۔ —— کمرہ کیا ہے اچھا خاصہ کباڑ خانہ ہے۔ اگر ایک چیز کو تلاش کرتا ہوں تو سینکڑوں چیزیں الٹ پلٹ کرنا پڑتی ہیں۔ سب سے زیادہ ناقابل برداشت تکلیف مجھے کتابوں کی ابتری سے پہنچتی ہے۔ اور اسی کمرہ میں دونوں بہنیں بھی سوتی ہیں —— ایسے وحشت خیز ماحول میں دماغ کی یکسوئی معلوم؟ —— اس قیامتِ صغریٰ کے اندر بھی جب کتابیں لیکر بیٹھو تو والد صاحب کا لکچر —— کبھی نہ ختم ہونے والا لکچر رہی سہی طاقتیں سلب کئے لیتا ہے۔"

حالات کی پیچیدگیوں پر پیچیدگیاں ——

"ابھی والد صاحب پر بیماری کی کمزوری باقی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو رہا ہے۔ گھر میں پیسہ نہیں۔ اِس لئے کیمیا سازی کی مشق زوروں پر ہے۔ روزانہ پارہ اور دیگر ادویات منگا منگا کر اپنی زیر ہدایت تجربات کرائے جاتے ہیں۔ بیچاری چھوٹی بہن اور میں خاموشی سے ہر ہر حکم کی تعمیل کرتے ہیں۔ مگر سونا آج بنتا ہے نہ کل ——— مگر وہاں یقین کی مستحکم بنیادوں میں ایک لمحہ کے لئے بھی جنبش نہیں ہوتی ——— میں اس دردِ سر سے بیحد نالاں ہوں اور اس قسم کی خرافات کے لئے ایک منٹ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن وہ یہ باور کراتے ہیں کہ وہ میرے لئے ایک بہت بڑی دولت ہے (کیمیا کے نسخوں کا قابل سوختنی مجموعہ) چھوڑ جائیں گے۔ اگر کیمیا گروں جیسا اٹل عقیدہ ویقین مسجد کے مُلّا کو حاصل ہوجائے تو عارف باللہ ہوجائے۔ اور اگر کسی دنیاوی اقتدار کے لئے جھک پڑے تو ہفت اقلیم کے پرچم جھکا دے مگر اس "چاہ کندن وکاہ برآوردن" کے مرض کی دوا کہاں سے لاؤں۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ یہ خدا کا قہر ہے جو کیمیا گری کا شوق بن کر عموماً بوڑھے دماغوں پر نازل ہوتا رہتا ہے۔ یہ وہ لعنت ہے جس سے چھٹکارہ نہیں ——— ہر ناکامی پر "ایک آنچ کی کسر" رہ جاتی ہے۔ اور پھر کام وہیں سے شروع کر دیا جاتا ہے۔ اس کو سوائے بدبختی کے اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ سونا تو خاک نہیں بنتا۔ اور بھری ہوئی جیب، گھر بار، حتیٰ کہ مجھ جیسے سعادت مند بیٹوں کا دماغ تک خالی ہوجاتا ہے۔ آہ!

نشاطِ خاطرِ مفلس ز کیمیا طلبی است!"

کیمیا، سازی کی لعنت اب بھی عام ہے۔ اور جو اس نوجوان کے دل پر بیت چکی ہے۔ بطور عبرت ایک حصہ اور اقتباس کرتا ہوں :۔

"والد سخت بیمار ہیں، مگر برا ہو اس کیمیا کا کہ یہ منحوس لت کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتی ——— کیمیا! ——— آہ!! کیا کہوں یہ کیسا خدا کا عذاب ہے جو اکثر مفلسوں ہی پر نازل ہوتا ہے اگر خوش حال ہو تو اس کی بدولت مفلوک الحال ہو جاتا ہے مگر اس سے تائب نہیں ہوتا ——— سب جھوٹے ہیں ——— بکتے ہیں ——— ہم نے آج تک کسی کو کامیاب ہوتے نہیں دیکھا۔ میں تو اس چیز سے اتنا متنفر ہوں کہ اگر کوئی شخص کہے کہ یہ اکسیر ہے، اس سے نہایت آسانی سے سونا بن جاتا ہے اور وہ خاک کی چٹکی سے ایسا کر کے بھی دکھا دے اور از راہ کرم وہ خاک کی چٹکی بھی مجھے عنایت بھی کر دے تو اسی وقت ہوا میں اڑا دوں۔ اور مجھے ذرا بھی صدمہ نہ ہوگا ——— اگر دنیا میں ایسا نسخہ ہو بھی اور اس سے اکسیر تیار بھی ہو جائے تو میرے نزدیک یہ سراسر قانونِ قدرت کے خلاف امور میں سے ہے۔ جس سے انسان کو بجز نقصان کے نفع کسی حالت میں نہیں پہنچ سکتا۔ خیال کرو، اگر قلب ماہیت ایسی ہی آسان ہوتی تو آج دنیا کے بڑے بڑے سائنسدان اور کیمسٹری کے ماہر جنھوں نے حیرت انگیز کارناموں سے دنیا کی گود مالامال کر دی ہے، جنھوں نے سمندروں کی گہرائیوں اور زمین کی پہنائیوں اور فلک کے ہر ہر سیارہ کو کھنگال ڈالا ہے، جنھوں نے اندر سبھا اور الف لیلہ کے فرضی قصوں کو سچ کر دکھایا ہے، جنھوں نے ہر ہر ذرہ پر کیمسٹری کا عمل کیا، نباتات سے ہمکلام ہوئے، جمادات کی جنھوں نے نبض پکڑی، جنھوں نے برق و باد کو قیدی اور غلام کیا" اور جنھوں نے زمین کی طنابیں کھینچ کر رکھ دیں ——— کیا وہ بازار کی منڈیوں میں سونے کو اتنا ہی گراں رہنے دیتے؟ کیا وہ سڑکوں پر بجائے تار

کوں کے سونا نہیں لیپ دیتے، اور سونے چاندی کی لاکھوں عمارتوں سے دنیا کے ہر ہر گوشہ گوشہ کو رو ینٹک نہ بنا دیتے ؟ ــــــــ بریں عقل و دانش بباید گریست !

جڑی بوٹیوں کے ذریعہ دھاتوں کو سونے کی شکل میں تبدیل کرنے کی سعیٔ لاطائل کرنا، اس سے کہیں بہتر ہے کہ انسان تھوڑا سا زہر گھول کر پی لے۔ اور بدن کو روح سے سونا کر کے ہمیشہ کے لئے سو جائے۔

کیمیا گری کا شوق بھی اسی طرف رہنمائی کرتا ہے، جس طرف سنکھیا، بلکہ میں تو کہوں گا کہ سنکھیئے سے یہ شوق زیادہ مہلک ہے۔ اس سے قویٰ ضعیف ہو جاتے ہیں۔ بیماریاں بڑھتی ہیں، ذہن میں پستی آتی جاتی ہے۔ اور خیالات کی رفعت ناپید ہو جاتی ہے۔ پھر اس ذلیل شوق سے نہ صرف اپنا بلکہ دوسروں تک کا نقصان ہوتا ہے۔ انسان دنیا کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ کسبِ معاش کے تمام دروازے اس پر بند ہو جاتے ہیں اور خود غرضی بھی بے انتہا پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ اور ان کے علاوہ بھی تمام خرابیوں کا سرچشمہ ہوتے ہوئے میں کیونکر سنکھیئے کو اس پر ترجیح نہ دوں ؟

انسان ایک غلطی کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ یہ بھی جانتا ہے کہ میں درحقیقت غلط راستہ پر ہوں تو اس کو اتنا برا نہیں کہا جا سکتا، اس کی اصلاح کا دروازہ بالکل بند نہیں ہوا۔ جب اس کا یہ احساس زیادہ قوی ہوگا، وہ اسی وقت تائب ہو جائے گا۔ اور اگر نہ بھی ہو تو اس غلطی کے ارتکاب میں اعتدال پر آجائے گا لیکن وہ جہل مرکب ہے، جو اپنی غلطی کو صحیح تصور کرتا ہے، اس کے اصلاح کی کوئی امید نہیں ہو سکتی۔ بس کیمیا گری کو اسی دوسری شق پر قیاس کر لو، جس میں نفع ایک رتی نہیں اور نقصان حدِ احصاد سے باہر ہے۔

بیاضِ مسیحا سے میں نے بھی ایک نسخہ نقل کیا ہے، جو کبھی خطا نہیں کرتا

اس سے سو فیصدی سونا بنتا ہے اور وہ ہے ـــــــ علم ـــــــ درحقیقت سونا وہی بنتا ہے جس کا دماغ علم کی روشنی سے مجلّی ہو۔ جس کے بازوؤں میں طاقت ہو، جس کی نگاہ میں عزم راسخ کی چمک اور خیالات میں رفعت ہو۔ اور آپ کنواں کھود کر پانی پینا جانتا ہو۔ اور بالکل کھرا سونا وہ بنتا ہے جو اپنے سے زیادہ بنی نوع کی تکلیف میں شریک ہونے کا احساس رکھتا ہو۔ جو خود کھانے سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتا ہو، جس کے بازو یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور مسکینوں کی اشک شوئی کے لئے وقف ہو چکے ہوں۔ اگر ایک روٹی پاس رکھتا ہو تو جب تک باقی نصف دوسرے کو نہ کھلا دے خود کی سیری نہ ہو"

ایسے جانگداز ماحول میں شاغل نے اپنی تعلیم جاری رکھی، خود بھی پڑھا، دوسروں کو بھی پڑھایا۔ تاکہ امتحان میں شریک ہونے کی فیس وغیرہ اسی طرح آسانی سے حاصل کی جا سکے۔ لیکن ہم سب جانتے ہیں کہ امتحان وہی بہتر دے سکتا ہے جس کے دماغ میں کوئی الجھن نہ ہو، اور جو نہایت صاف ستھرے دماغ کے ساتھ امتحان کے کمرہ میں داخل ہو، پر شاغل جیسے طالب علم کی قسمت ایسی کہاں؟ ـــــــ نجانے کن مصائب سے سفر خرچ اور دیگر ضرورت کی چیزیں فراہم کرکے لاہور روانہ ہوا اور گرتا پڑتا عین وقت پر کمرۂ امتحان میں داخل ہو کر جو کچھ جوابات لکھ سکا اور اسکا جو نتیجہ برآمد ہوا، اسی کی زبان سے سنئے :-

"دو تین روز ہوئے امتحان کا نتیجہ نکل آیا، بدقسمتی سے فیل ہو گیا ـــــــ سوائے بدقسمتی کے اور کیا کہوں، جبکہ وہ لڑکے جن کو میں نے منشی فاضل کی تین چار کتابیں ختم کرائیں تھیں، پاس ہو گئے اور مجھے پھر نئے سرے سے بازی جانا پڑی تو اب اس اتفاق کو اور کس چیز کی طرف نسبت دوں؟ ـــــــ خدا جانے کن دقتوں سے، کتنی کچھ ضروریات کو پس پشت ڈال کر امتحان میں شریک ہوا تھا ـــــــ

آیندہ سال کے لئے خدا مالک ہے۔ اگر روپیہ ہوگیا تو شریک ہوجاؤں گا ورنہ اللہ اللہ خیر صلاح!...............

آج یونیورسٹی سے آیا ہوا اطلاعی کارڈ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ جواب مضمون اور ترجمہ کا آخری پرچہ جس میں پاس ہونے کی مجھے سو فیصدی امید تھی، اسی میں فیل تھا، باقی پانچ پرچوں میں جن میں سے دو پرچے ایک نثر کا دوسرا اخلاق و تصوف کا جو کہ بہت اہم تھے ان میں نہایت اچھے نمبروں سے پاس تھا۔

وائے محرومی فلک نے تاک کر توڑا اسے
میں نے جس ڈالی کو تاکا آشیانہ کے لئے!

اس قسم کے سخت سے سخت تر حالات نے شاغل کو سماج کے ذرہ ذرہ سے متنفر کر دیا اور وہ کچھ باولا سا ہو کر یقین و ایمان کی مضبوط چٹان کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگا۔

"شاید میرا خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ آہ!............ اگر ایسا ہے تو وہ طریقہ کہاں سے ڈھونڈوں جس سے خدا کو منایا جا سکتا ہے۔ کیا نماز روزہ سے نہیں نماز روزہ خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچاتے۔ یہ صحیح ہے کہ میں پابندی سے نماز نہیں پڑھتا۔ روزوں میں تساہل برتتا ہوں۔ لیکن جن کی پیشانیاں رات دن کی سجدہ ریزی سے زخمی ہو چکی ہیں، جن کی صورت روزے رکھتے رکھتے چھوارہ ہوگئی ہے جو قائم اللیل و صائم الدہر ہیں، جنھوں نے لاتعداد حج کئے ہیں، اور زکوٰتیں ادا کی ہیں، اس کے نام کا کلمہ پڑھتے پڑھتے تسبیح کے دانے گھس دیئے ہیں، اور کئی مصلے تار تار کر دیئے ہیں۔ کیا خدا ان سے راضی ہے؟............ نہیں! لَا رَہبانیۃَ فی الاسلام، ہرگز نہیں!............

اگر ایک شخص دنیوی امور میں شائستہ نہیں ہے تو دین میں اس کی منزلت معلوم! کیا ان خانقاہ نشینوں کے ذہن میں کبھی یہ سوال بھی پیدا ہوا ہے کہ جن کو رات دن کی عبادت کا یہ ثمرہ ملا کہ جلال و قہر کے مظہر بن کے رہ گئے۔ اگر مقصدِ تخلیق صرف "عبادت" تھا تو دوسرے جھگڑے اس کے پیچھے کیوں لگائے؟ ــــــــ یہ اتنی لمبی چوڑی دنیا کس لئے پیدا کی؟ اگر واقعی ہمارے علماء و صوفیاء کا خیال ٹھیک ہے تو میں ایسے ظالم خدا کو ماننے سے صاف انکار کرتا ہوں۔

"کچ دار و مریز" کیا یہ ظلم نہیں ہے کہ ہمارے پیچھے آفات ارضی و سماوی بھی لگا دیں، ہمارے دل میں دنیوی خواہشات کا طوفان بھی برپا کر دیا، ہم میں رشتے ناتے الفت و موافقت بھی قائم کی اور مقصد ان سب کا یہ ٹھہرا کہ:۔

کاٹ ڈالوں گا زباں تو نے اگر فریاد کی!

اک کندۂ ناتراش نے نہایت طمطراق سے، فخر سے نتھنے پھلاتے ہوئے یہ آیت پڑھی اور اس عزم کے ساتھ کہ اب اس کا میرے پاس کوئی جواب ہی نہیں ہو سکتا۔ اس گدھے کو کیا معلوم کہ اس آیت پر میں اب سے بہت قبل غور کر چکا ہوں:۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

اگر اس آیت میں عبادت سے مراد یہی ظاہری نماز روزہ ہے تو خدا نے کئی جگہ شجر، حجر، کنکر، پتھر وغیرہ کے لئے بھی ارشاد فرمایا ہے کہ وہ ہماری عبادت کرتے ہیں .... حمد و تسبیح کرتے ہیں ــــــــ رکوع و سجود کرتے ہیں، حالانکہ ہم نے آج تک موالید ثلاثہ و اربعہ عناصر میں سے کسی کو حمد و تسبیح یا عبادت کرتے نہیں دیکھا اور جب ہم ان کی عبادت نہیں دیکھ سکتے تو مثال بیکار رہوئی ــــــــ ان چیزوں کی عبادت سے مراد یہ ہے کہ ان کو جس نوع پہ پیدا کیا گیا ہے، وہ اپنا کام

اسی طرح کرتے ہیں۔ مثلاً جب پتھر کو اوپر سے چھوڑا جائے گا تو وہ نیچے گریگا۔ آگ میں جب کوئی چیز ڈالی جائے گی تو وہ جلا دیگی ـــــــ اسی طرح انسان کی عبادت یہ ہے کہ وہ دیگر مخلوق کے لئے ضرر رساں نہ بنے جب دنیا میں پیدا کیا گیا ہے تو ہر ممکن طریقہ پر اہل دنیا کی خدمت کرے، ایثار سے کام لے ـــــــ انسان کی عبادت میں اور موالید ثلاثہ و اربعہ عناصر وغیرہ کی عبادت میں فرق یہی ہے کہ ان کو جس خدمت کے لئے مامور کیا گیا ہے وہ بلا سوچ سمجھے اس کو پورا کرتے رہیں گے، پتھر جب اوپر سے چھوڑا جائے گا تو یہ نہیں دیکھیگا کہ میرے نیچے بلور کا جام ہے یا مٹی کا گھڑا، وہ گر پڑیگا آگ جلاتے وقت ریشم و ٹاٹ کے فرق پر نظر نہ رکھیگی۔ مگر انسان با عقل و تمیز بنایا گیا ہے اس کو ان نسبتوں کا خیال کرنا ہی ہوگا۔ اور جو ایسا نہ کرے وہی کافر ہے ـــــــ اس کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ اس کی زیر ہدایت خدمت کرے،

عبادت کے معنی بندگی، سیوا اور خدمت کے ہیں۔ تم خدا کی مخلوق کی خدمت کرو، خدا تم سے راضی ہوگا۔ نماز روزہ کا میں منکر نہیں، ان کو تہذیب نفس اور خدمت خلق پر ہموار کرنے کے لئے ہی فرض کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں وہ نماز منہ پر ماری جائے گی، جس کے ادا کرنے سے دوسرے عذاب میں مبتلا ہو جائیں۔ اس روزہ کی کوئی قیمت نہیں جس سے بھوکے پیٹوں کا مداوا نہ سوچا جائے۔ وہ زکوٰۃ لعنت ہے جو مستحق کو دینے کے بجائے نام نمود پر صرف کیجائے۔ یا لوگوں میں فساد برپا ہو۔ اس حج سے یورپ وغیرہ کا سفر بہتر ہے جو امداد باہمی کے علاوہ کسی اور غرض پر مشتمل ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اول انسان کو اپنی دنیا سنوارنی چاہیئے، پھر دین خود بخود سنور جائے گا۔ دین ہماری دنیوی اصلاح کے لئے ہی تو آیا ہے۔ اگر اس سے یہی چیز مٹتی ہے، تو ایسا دین کس کام کا؟ ـــــــ

ہم رات دن دعاؤں میں قرآن شریف کی یہ آیت پڑھتے ہیں۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنتہ وفی الآخرۃ حسنتہ وقنا عذاب

نار۔

مگر افسوس ہے کہ اس کی معنویت پر کتنے ہیں جو غور کرتے ہیں ؟ ——— اس آیت شریف میں پہلے دنیا کی بھلائی چاہی گئی ہے۔ اور دین کی بعد میں ——— یہ بحث آسانی سے ختم ہونے والی نہیں، ——— اور نہ میں اس وقت اس پر مکمل تبصرہ ہی کرنا چاہتا ہوں، پھر کسی وقت اس پر نظر ڈالونگا ——— میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ ——— شاید میرا خدا مجھ سے ناراض ہوگیا ہے۔ مگر خاکم بدہن میں بھی تو اکثر اس سے ناراض ہو جاتا ہوں۔ یہ تو عبد و معبود کے راز و نیاز ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ میری ناراضگی سے بجز میرے اس ذات بے ہمتا کو کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ اور نہ میری رضا مندی ہی اس کے لئے سود مند ہے اور اگر واقعی خفگی اس جانب سے ہے تو میری بربادی کا کیا ٹھکانا !۔

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک،

میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

اے معبود ! ——— اے ہزار ہا ہزار مخلوق کو پیدا کرنے والے خالق مطلق !! ——— اور اے پشہ و مور کو رزق پہنچانے والے رازق !!! ——— تو بے نیاز ہے، آزاد ہے ہم غلاموں کی بھی سن ! تو تو بڑا سننے والا اور بڑا عطا کرنے والا ہے، تو نہیں سنے گا اور تو نہیں عطا کرے گا تو اور کون سنے گا اور کون عطا کریگا۔ اے آقا ! ہم سے منہ نہ موڑ۔ تیرا در چھوڑ کر کہاں جائیں ——— جب تو نے پیدا کیا ہے تو ہمیں عام مخلوق سے علیحدہ کیوں بنایا۔ یا تو تو مجھے بھی انھیں جیسا کر، یا حالات میرے مطابق بنا ! تو خوب جانتا ہے کہ غلام کا کوئی مذہب اور اخلاق نہیں ہوتا۔ پھر ہماری گردن میں یہ طوق کس لئے ڈالا ہے، مجھے یقین ہے کہ

جب تو رحم مادر میں میرا رزق مجھ کو عطا کرتا رہا، یا عالم طفلی میں تو مجھے نہ بھولا، تو اسے رب الارباب! اب جبکہ تیرے عطا کردہ قویٰ کے نشوونما کا زمانہ آیا ہے تو کیونکر بھول سکتا ہے یہ میری ہی بھول ہے جو ایسا خیال کیا۔ تو میری نافرمانیوں اور خطاؤں پر مت جا! تو اپنی شان دیکھ! واسطہ محمدؐ کے اس سینہ کا جس پر تو نے اپنا کلام نازل کیا ——
واسطہ اس عزم کا جو بدر و حنین میں پیروانِ دمورث ایمانی کا قائد رہا ——
واسطہ اس فصیح اللسانی کا جس کے سامنے شمشیروں کی آب اتر گئی ——
واسطہ اس یتیمؐ کی جوتیوں کا جن سے تو نے عرش اعظم کو زینت بخشی ——
اور صدقہ اس بے گناہ خون کا جو کربلا کے ذروں میں امانت رکھا گیا۔ اور اسے معبود! —— واسطہ تجھ کو اپنی شانِ کریمی کا —— یہ صبر بہا حالت دور کر دے، میرے قلم میں وہ جادو بھر دے جو دل میں گھر کر لیتا ہے۔ وہ روانی دے جو دریا کو شرما دیتی ہے، وہ بجلی عطا کر جو نگاہوں کو خیرہ بنا دیتی ہے، میری زبان کو شیریں بنا، کلیجوں کو برما دینے والا لب و لہجہ عطا کر، خوشنما تراکیب و حسین الفاظ کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ دے، میرے دماغ میں وہ روشنی پیدا کر جو دلنشین پیرایۂ اسلوب وا داتخلیق کرتی ہے۔ تیرے خزانہ وجود میں کس چیز کی کمی ہے؟
—— میں تجھ سے صرف دو چیزوں کی بھیک مانگتا ہوں —— قلم —— اور زبان —— اسے مالک! میری خواہش تو خوب جانتا ہے کہ بالکل فطری ہے۔ میں اسی راہ سے تیری مخلوق کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔
تو مجھ کو اس کا موقعہ دے، تجھ کو اپنے حبیبؐ کی بے پناہ فصاحت کا واسطہ ——
مجھ کو بھی اس دسترخوان کے چند ریزے چن لینے کی طاقت عطا کر، تاکہ میں لکھتا رہوں —— بولتا رہوں —— اور لکھتا رہوں —— ہمیشہ —— ہر وقت —— پھر لکھوں —— اور کبھی نہ تھکوں!

——— تو اپنے بندوں سے انواع واقسام کے طریقوں سے خدمت کراتا ہے، عبادت کراتا ہے، وہ انھی طریقوں پر تیری مخلوق کی خدمت کرتے ہیں اور خوش رہتے ہیں اے فہم وادراک سے ماوراء! ——— اے بڑوں کے بڑے! تمام قسم کی پاکیزگی و بڑائی اور بزرگی صرف تجھی کو سزاوار ہے ——— کیا اس روحانی خوشی کا کچھ حصہ اس غم نصیب کے مقدر میں نہیں؟ ——— اے زبان و قلم پیدا کرنے والے! میں زبان وقلم سے تیری مخلوق کی خدمت کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی مقدرت عطا کر، اس ذریعہ سے میں کوئی ایسا نمایاں کام کرنا چاہتا ہوں کہ کل تیرے حضور خوشی کے آنسو بہاتا ہوا، شوق کے قدموں سے دوڑتا ہوا، تحفہ لیکر حاضر ہوں ——— یہ ملازمت، غلامی، ذلت ——— اے آقا، میرے بس کی نہیں! ——— تو نے تو مجھے اپنی غلامی کے لئے بنایا ہے، میں تیرے در کے سوا اور کہاں یہ پیشانی رگڑوں؟ مجھے تو یہ آتا ہی نہیں ——— یا تو مقصد تخلیق کو مجھ سے پورا کرا ورنہ جلد سے جلد اسی لمحہ مجھے اس دنیا سے اٹھا لے. میں بغیر خدمت خلق کے مقصدِ عظیم کے یہاں زندہ رہ کر مفت کی شرمندگی مول لینا نہیں چاہتا ——— اے اللہ!"

زبان وقلم سے شاغل کو جس درجہ لگاؤ تھا، جا بجا اس کی تڑپ نظر آتی ہے ایک اور جگہ سے کچھ اقتباس کرتا ہوں :۔

"عمر خیام میرے خاص ذوق کی چیز ہے۔ میں اس کو ہمیشہ مطالعہ میں رکھتا ہوں۔ میں جب اس کی رباعیاں دیکھتا ہوں تو دنیا وما فیہا سے بے خبر ہو جاتا ہوں اس کا ہر ہر نظریہ میرے ہی دل کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے۔ اسکی ایک رباعی :۔

در راہ چناں رو کہ سلامت نکنند
با خلق چناں زی کہ قیامت نکنند
در مسجد اگر روی چناں رو کہ ترا
در پیش نخوانند و امامت نکنند!

میں بالکل اسی طرح سادہ زندگی بسر کرنی چاہتا ہوں۔ میری دلی تمنا یہی ہے کہ صحیح معنیٰ میں اِس رباعی کا نمونہ بن جاؤں۔

بعض لوگ مجھ سے سوال کرتے ہیں کہ زندگی کے لئے تم نے کیا سوچا ہے؟ اِس کے جواب میں شاید میرے خیالات کو "پستی ذہن" پر محمول کیا جائے ———— لیکن میں کیا کروں میرا تو صرف ایک ہی مقصدِ حیات ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ بقدرِ امکان اپنے اور لواحقین کی خدمت کرتے رہنا، اگر خدا توفیق دے تو اپنے وطن بلکہ تمام دنیا کی بھی۔ اِس کے علاوہ میری زندگی کا کوئی مقصد نہیں ———— اور میں ہر وقت خدا سے دعا کرتا ہوں کہ وہ اس کے حصول و تکمیل میں میری اِستعانت فرمائے۔ آمین! ———— جن کے پیشِ نظر یہ مقصد ہے اور با حسنِ وجوہ اسکو انجام بھی دیتے چلے جا رہے ہیں، وہ میرے نزدیک لائقِ صد احترام ہیں۔ باقی اور مقصد کی میرے نزدیک کوئی قیمت نہیں۔ اور نہ میں اپنے ذہن کو ایک لمحہ کے لئے کسی اور طرف منتقل کرنا چاہتا:-

تو جگ میں آیا جگت سراہے تو ہے
ایسی کرنی کر چلیو کہ پاچھو ہنسی نہ ہوئے

یاد داری کہ وقتِ زادن تو
ہمہ خنداں بوند تو گریاں

آنچناں زی کہ وقتِ مردن تو
ہمہ گریاں بوند و تو خنداں!

رہا دنیوی اعزاز تو وہ کچھ بھی میرے لئے جاذبِ توجہ نہیں، اور اگر کسی
لمحہ مجھ کو اس کے حصول کی رغبت ہوتی بھی ہے تو میں خوب جانتا ہوں کہ مجھ سے صاف
باطن ـــــ حاشا کہ اس میں کوئی کلام نہیں! ـــــ کے لئے یہ اندازِ
افتخار قطعاً ناممکن ہے یا میں اپنی بے ہنری کی وجہ سے اس کا اہل نہیں۔ مجھ میں جو
کچھ علمی قابلیت ہے اسی کا فیصلہ کرنے والا میں کون؟ ـــــ لیکن یہ خوب
جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی بھی ہنر نہیں ہے۔ تجارت کی طرف میرا ذرا بھی میلان نہیں
ـــــ زراعت بھی میرے بس کی نہیں، پھر کس برتہ پر دنیوی اعزاز کی تمناء
کروں؟ ـــــ اب رہے دیگر رہی یہ غلامی سو میری خودداری کسی کے در کے
بلا وجہ چکر لگانا گوارہ نہیں کرتی۔ اور اس کے بغیر ملازمت کی بقاء و ارتقاء ممکن
نہیں۔ اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کے سامنے گردن جھکانا، خوشامد و چاپلوسی
کرنا، گرم و سرد نگاہیں برداشت کرنا ـــــ اس کے مقابلہ میں فاقہ کشی
آسانی سے قبول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی حد تک میں موجودہ صورت پر قانع ہوں
یعنی گو مجھے صرف پندرہ روپئے ملتے ہیں۔ اور گو میرا نام "چہرۂ خام" کے پلندوں
میں لکھ کر دفتری کا کام لیا جاتا ہے، گو مجھے تعطیل کا حق نہیں اور اگرچہ یہ گھس گھس
بھی غیر مستقل ہے تاہم شکر ہے کہ مجھے افسروں کی روبکاری میں مسکین چہرہ بنائے
کھڑے کھڑے سوکھنا نہیں پڑتا۔ ان کی بیجا تلخیاں سہنے پر میں مجبور نہیں ہوں
جن انسپکٹر صاحب کی ماتحتی میں کام کرتا ہوں، خدا انھیں خوش رکھے کہ بالکل
مساویانہ سلوک کرتے ہیں۔

میں لاکھوں کی املاک کا مالک بننا نہیں چاہتا، آسمان رتبہ محلوں کی مجھے

تمنا نہیں۔ خدم وحشم کو اپنی انسانیت کی ہتک سمجھتا ہوں۔ ہوائی اڈے اور سواری کی موٹریں میرا مطمع نظر نہیں۔ سلطنت کا کوئی بڑا عہدہ اینٹھ کر عوام سے اپنا آستانہ بلند رکھنا نہیں چاہتا۔ مصاحبین کی چاپلوسی اور خوف زدہ ماتحتوں کے فرشی سلاموں سے مجھے دلی نفرت ہے۔ پھر آخر میں کیا چاہتا ہوں؟ —— آہ! کاش میری سادہ تمنائیں قبولیت کا چہرہ دیکھیں! ۔

سر چھپانے کو معمولی مکان، سادہ طریقہ زندگی کے لئے بقدر احتیاج روپیہ۔ —— پس یہ میری بہترین تمناؤں میں سے ہے آرام وسکون اور خاموشی کے ساتھ چند ہمخیال لوگوں کی صحبت، سادہ معاشرت کے ساتھ خدمت خلق کرتا ہوا اس دنیا سے رخصت ہو جاؤں۔ اللہ اللہ خیر صلاح!

تنہائی اور سکون بھی مجھے بیحد پسند ہیں کہ دل بھر کے مطالعہ کرتا رہوں۔ پھر یہ زندگی مفت میں بھی حاصل کرنا نہیں چاہتا۔ کسی کا بار احسان اٹھانا نہیں چاہتا۔ بلکہ جیسی سادہ تمنا ہے، ویسی ہی سادہ وبے شور کوئی خدمت انجام دے کر اپنا مقصد حاصل کرنا چاہتا ہوں —— خانہ داری وازدواج کے جھگڑوں میں پسنا، اور اپنے بوتہ سے زیادہ ذمہ داریاں لیکر نامنصف کہلانا مجھے منظور نہیں۔ چونکہ انسان ہوں، اس لئے انسانوں سے ملنا ترک نہیں کر سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انسانوں کی صحبت اسی قدر چاہتا ہوں کہ آٹے میں نمک! —— میں اس وقت تک ایک دلچسپ انسان رہ سکتا ہوں کہ انسانوں کی مجلس میں میری نشست طویل نہو۔ زیادہ دیر گزرجانے پر میرے اوپر وہی افسردگی وقنوطیت چھا جاتی ہے۔ جو انجمن کو مردہ کردے۔ میں لوگوں کی صحبت سے بہت جلد دل سیر ہو کر سوچ وچار، غور وفکر کی دنیا میں چلا جانا چاہتا ہوں۔ اس وقت اگر مجھ کو مجلس سے علیحدہ ہو جانے کا موقعہ نہ ملے تو یہ وقت میرے لئے

بڑا کٹھن ہوتا ہے، ہر شخص حیرت کرنے لگتا ہے کہ ابھی تو یہیں بحث و مباحثہ میں سب سے آگے تھا، بیسری ظرافت و خوش فعلی شور محشر برپا کر رہی تھی، ہنسی سے دہرا ہوا جا رہا تھا اور اب افسردہ و مغموم، ساکت و صامت کیوں ہو گیا؟ —— طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں، گمان ہوتا ہے کہ شاید ناراض ہو گیا ہوں —— مگر؟

مجھے دماغ کہاں خندۂ ہائے بیجا کا!

انسانوں کی صحبت سے کتابوں کی صحبت میں زیادہ وقت گزارنا چاہتا ہوں۔ مگر حال یہ ہے کہ ایک جان ہے اور سینکڑوں عذاب:-

ایک روز کا رونا ہو تو رو کر صبر آئے
ہر روز کے رونے کو کہاں سے جگر آئے

ہائے غریبی! —— میں خوب جانتا ہوں کہ تیری گرفت کتنی مضبوط ہوتی ہے —— خوب سمجھ گیا ہوں کہ افلاس کس بلا کا نام ہے! اور اس میں مبتلا ہو کر آدمی کے ہنر کس طرح دھیرے دھیرے عیب بنتے جاتے ہیں!"

بہت ہی خوب ہوا کہ شاغل ہمیشہ غریب ہی رہا، ورنہ غریبوں —— ان غریبوں کی جو بڑی بڑی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اور بوجہ اپنے افلاس کے بھول جاتے ہیں کہ ان کا مقصدِ تخلیق کیا تھا، کون ایسی بلیغ نمائندگی کرتا۔ افسوس اب بھی جو غریب ہیں وہ غریب اتنا بھی نہیں جانتے، نہ اپنی ہی نفسیاتی تحلیل کر سکتے ہیں اور نہ افلاس گیر محرکات کی رگ پکڑ سکتے ہیں۔ پھر اگر ان کی صحیح مقام سے آگاہی ایک ذی علم نہ کرے تو کون کرے؟ —— آگے دیکھئے اپنے ہی جیسے ایک طالب علم کی ستائش کے ذیل میں کیسے کیسے تیر و نشتر

فراہم کئے ہیں:۔

" شام تک " مدینہ " دیکھتا رہا ——— اس میں ایک طالب علم کی الوالعزمی کا حال دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ مادرِ ہند کو ایسے ہی الوالعزم وجوان ہمت سپوتوں کی ضرورت ہے۔ یہاں کی بے حس اور مردہ فضا میں ایسی ہی مقدس ہستیاں زندگی کی لہریں دوڑا سکتی ہیں۔ یہی وہ جوان سال ہیں جو اپنی تاریخ آپ مرتب کرتے ہیں:۔

لڑکے کا نام جنید الدین ہے جو مجیدیہ اسلامیہ ہائی اسکول کے درجہ نہم میں اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ یہ ہونہار بروا ضلع الہ آباد کے قصبہ بیگم سرائے کے ایک بہت بڑے خاندان کا چشم و چراغ ہے، کمسنی میں والدین کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ نانا اور چچا نے پرورش کی۔ لیکن اب جب زندگی کی تعمیر و اصلاح کا پاک جذبہ پیدا ہوا تو اس نیک بخت نے تمام خاندان کی امداد سے شکریہ کے ساتھ دست کش ہو کر اپنی مدد آپ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اور اب وہ شہر کے اخباری ایجنٹوں سے اخبار اور رسالے لیکر فروخت کرتا ہے۔ بچوں کو پڑھاتا ہے۔ اور اس طرح زندگی اور تعلیم کے اخراجات پورے کر رہا ہے۔ جب اس کو مشورہ دیا گیا کہ اسکول کی فیس معاف کرا لو تو ——— قربان جائیے کیا پیارا جواب دیتا ہے، جس میں زندگی و بلندی کی صحیح روح جھلک رہی ہے:۔

" میرا اسکول خود غریب ہے، میں اگر اس کی امداد نہیں کر سکتا تو اس پر بار بننے کا مجھے کب حق حاصل ہے؟"

قابل صد احترام تھی وہ ماں جس نے ایسا عالی حوصلہ بچہ جنا ——— اور مبارک ہے وہ اسکول جس میں ایسا بلند ہمت طالب علم تعلیم پائے۔ خدا نظر بد سے بچائے۔ تیور کہے دیتے ہیں کہ آئندہ یہ ہستی اعاظم الرجال کی صف اول میں جگہ

پائے گی:-

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

اے بچے! کاش تو میرے ساتھ ہوتا، ——— خوش رہ! تیری فلک پیما ہمت عرش کی بلندیوں کو چھوئے۔ افسوس تو ایسے ملک میں پیدا ہوا، جو سراسر پست ہمتی کی تربیت گاہ ہے۔ جس کے افکار میں سستی و پستی ہے، جس کا نحیف بدن جہل و غلامی کی آتشین زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے ——— میرے دل سے نکلی ہوئی خاموش دعائیں تیرے ساتھ ہیں۔

بنا کردند خوش رسمے بخاک و خون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را!

اِن اِقتباسات کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ بجھوتۂ قلب یہ صرف اپنے لئے لکھے گئے تھے۔ اِس لئے شوکت و شہرت کے بدنما جذبات سے پاک ہیں۔ مرحوم کی عادت تھی کہ واردات قلبی کو اپنی نجی ڈائری میں لکھ لیا کرتے تھے اس لئے زیادہ تر میں نے تمام اسناد اسی سے اَخذ کی ہیں کہ سچائی و للّہیت اس مجموعہ کے ایک ایک لفظ سے آشکار رہے۔

اب اس کے بعد یہ دلگداز باب بند کرتا ہوں اور جستہ جستہ شاغل کی معانی آفرینی، منظر کشی اور نقد و تبصرہ کی بے پناہ صلاحیتوں کے چند نمونے درج کرتا ہوں جو بالکل برداشتہ قلم ہیں:-

"آج تالاب کے کنارے کوئی دل جلا، لسان الغیب حافظ علیہ الرحمۃ کا یہ شعر پڑھ رہا تھا:-

کس ندانست کہ منزل گہ مقصود کجا ست

ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

انھیں قدموں وہیں بیٹھ گیا ــــــ اور اس گنجینۂ معنی کے طلسم میں کھو کر جھومنے لگا۔ کشمکشِ حیات کی اتنی جامع اور اس قدر مختصر الفاظ میں تفسیر کر دینا حافظ ہی جیسے باکمال کا کام تھا ــــــ زندگی کیا ہے؟ ایک صعوبت و کلفت سے بھرا ہوا بے معنی سفر!

کروڑہا کروڑ انسانوں کا ایک کاروان سفر کر رہا ہے ــــــ کئے جا رہا ہے ــــــ لا معلوم زمانہ سے جاری ہے ــــــ اور کوئی نہیں جانتا کہ کب تک جاری رہیگا۔ ہر مسافر کے سر پر سفر سوار ہے ــــــ ایک غیر مرئی قوت انھیں چلا رہی ہے۔ حوصلہ شکن پہاڑ بھی ہیں ــــــ حد نگاہ تک پھیلے ہوئے بے آب و گیاہ ریتیلے میدان بھی ــــــ ناقابل عبور سمندر بھی ــــــ ٹھگوں کا سامنا بھی ــــــ قدم قدم پر بلائیں اور طوفان بھی ــــــ سینہ کو برما دینے والے سرد ہوا کے جھکڑ اور بادِ سموم بھی ــــــ اُبلتے پانی و منجمد دلدل بھی ــــــ لیکن دُھن کے پکے مسافر کمریں کسے ہوئے پسینہ میں شرابور، فلک بوس پہاڑیوں، اندھیاری گھاٹیوں، لق و دق جنگلوں پر پیچ دریاؤں، اور ریتیلے ریگستانوں کو مسلسل اور مسلسل طے کرتے چلے جا رہے ہیں ــــــ چلے جا رہے ہیں بعض ٹھگوں کے دل لبھانے میں آ کر ستانے لگتے ہیں، اور اپنی ساری پونجی لٹا لٹا کر، آہ و بکا کرتے پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ــــــ سفر ــــــ ایک لا متناہی سفر ــــــ ہر شخص سفر کر رہا ہے ــــــ جو طاقت ور ہیں آگے نکل گئے ہیں ــــــ جن کے پاس سواری ہے وہ اُن سے بھی آگے ہیں لیکن ایسے لاتعداد ہیں جو نہ سوار ہیں، نہ طاقت ور، بلکہ لنگڑے، لولے مفلوج و نابینا ــــــ

کسی کو بخار ہے ۔۔۔۔۔۔ کسی کو کوڑھ نکلا ہے ۔۔۔۔۔۔ سردی گرمی سے بچاؤ
کے کسی کے پاس کپڑے نہیں ۔۔۔۔۔۔ کسی کا زادِ راہ ختم ہو چکا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی
ہنستا ہوا چل رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی روتا ہوا ۔۔۔۔۔۔ کوئی گاتا ہوا ۔۔۔۔۔۔
کوئی کراہتا ہوا ۔۔۔۔۔۔ کوئی خدمت بھی کرتا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی ہمتوں
کو ابھارتا چل رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ بڑھے چلو، بڑھے چلو! کوئی کہنیوں سے دوسروں
کو گراتا جاتا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی رینگ رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی گھسٹ رہا ہے
۔۔۔۔۔۔ کوئی اٹھتا بیٹھتا چل رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ کوئی گردن فراز و تیز تیز ۔۔۔۔۔۔
کوئی بڑبڑاتا ۔۔۔۔۔۔ کوئی گرجتا ۔۔۔۔۔۔ کوئی زخمی ۔۔۔۔۔۔ کوئی برہم
۔۔۔۔۔۔ غرض ہر طرح سفر ہو رہا ہے، ہر شخص سفر کر رہا ہے ۔۔۔۔۔۔ کئے جا رہا ہے
۔۔۔۔۔۔ مگر کسی کو نہیں معلوم کہ :-

"منزلِ گہ مقصود کجا ست"

کوئی نہیں جانتا کہ اس سفر کا انجام کیا ہوگا! کہاں پہنچیں گے؟ ۔۔۔۔۔۔
کیا ملے گا ۔۔۔۔۔۔؟ اِن سوالات کے مختلف جواب ہیں ۔۔۔۔۔۔ مگر تسلی بخش
ایک بھی نہیں ۔۔۔۔۔۔ بس سفر ۔۔۔۔۔۔ رات دن سفر ۔۔۔۔۔۔ ہر گھڑی
و ہر آن سفر ۔۔۔۔۔۔ لامعلوم سفر ۔۔۔۔۔۔ سفر! ۔۔۔۔۔۔ اوّل سفر
آخر سفر ۔۔۔۔۔۔ آغاز و انجام سفر ۔۔۔۔۔۔ صبح سفر شام سفر ۔۔۔۔۔۔
اس سفر کا مقصد ہی سفر ۔۔۔۔۔۔ بس چلنا ۔۔۔۔۔۔ بڑھے چلنا ۔۔۔۔۔۔
نگاہ جمائے ۔۔۔۔۔۔ قدم ملائے ۔۔۔۔۔۔ جرس کی آواز برابر کانوں میں آ رہی ہے
اور سفر جاری ہے ۔۔۔۔۔۔ کہ ایک بلند ٹیلے پر سے نباضِ فطرت، مستِ خودی،
شیخ شیراز رح کی باریک بیں نظر اس کاروانِ زیست پر پڑتی ہے اور اس کی زبانِ فطرت
ترجمان سے یہ نغمہ پھوٹ نکلتا ہے :-

کس ندانذ کہ منزل گہ مقصود کجا است
ایں قدر ہست کہ بانگ جرسے می آید!

کائنات کا ذرہ ذرہ یہ نغمہ سن کر جھوم اُٹھتا ہے ——— پتہ پتہ کی زبان سے یہی نغمہ اُبل پڑتا ہے۔ جرس کی آواز اور تیز ہو جاتی ہے ——— مسافر اور تیزی سے قدم بڑھاتے ہیں ——— آسمان کے فرشتے بھی یہی نغمہ گانے لگتے ہیں ——— فردوس کی حوریں بھی انگڑائیاں لیتی ہوئی نور کی کھڑکیوں سے اس منظر کو دیکھنے میں محو ہو جاتی ہیں اور ان پر نورانی پھولوں کی بارش شروع کر دیتی ہیں۔ اور ان کے دلوں میں بھی ایسے بے مقصد سفر کرنے کی آزاد کروٹیں لینے لگتی ہیں، اور بالآخر اپنے نورانی رباب لیکر خالق کائنات کے حضور میں اسی نغمہ کو الاپنے لگتی ہیں ——— کس ندانذ کہ ....

لبِ یزدانیت پر ایک آہانہ تبسم مرتعش ہوتا ہے، یدِ قدرت نطقِ سماوی کے آبدار موتی شاعر کی گود میں ڈالکر اس کے تمام نغموں کو غیر فانی کر دیتا ہے ———

خدا جانے وہ کونسی مبارک گھڑی تھی جو میں نے یہ شعر سنا، دل میں خفیف سی گرمی پیدا ہوئی، مدت سے اجڑے ہوئے ویران سینہ میں ہلکی سی تڑپ پیدا ہوئی لفظ "ایں قدر" کی نزاکت اور نغمہ آفرینی نے دماغ کی خوابیدہ طاقتیں بیدار کر دیں ——— اے کاش اس شعر کے صدقے میں میرے دل میں بھی گداز بڑھے اور ایسے ہی نغمے میرے لبوں پر بھی جاری ہو جائیں ——— کاش! میں کچھ اور لکھ سکتا!!؟

بھوپال کے مناظر کے بڑے والہ و شیدا تھے، اور پھر بارش میں تو واقعی بھوپال کشمیر ہو جاتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:-

"ہائے یہ بارش کا زمانہ، تمام عالم پر شباب کی بارش ہو رہی ہے ——
بھوپال کے قدرتی مناظر دعوتِ نظارہ دیتے ہیں —— تالاب بھی پور آ گیا ہے —— ندی نالے بہ نکلے ہیں —— سبز پوش پہاڑیاں مردہ بڑیوں میں تازگی بھر رہی ہیں —— ہر شخص اپنے اپنے دوستوں کے ساتھ مصروفِ نظارہ و تفریح ہے —— لیکن قدرت کے ان گراں بہا عطیات میں میرا کوئی حصہ نہیں —— اگر ان مقامات پہ جاتا بھی ہوں تو الٹا ناقابلِ بیان غم ہو لیکر آنا پڑتا ہے —— کہ میرا کوئی ساتھی نہیں! —— ایک مزدور کی دنیا؟ اور اس دکھی دنیا میں بجز حسرت و یاس کے اور کون ساتھی ہے —— بارش کا میرے پاس کوئی سامان نہیں —— لوگ پکنک کرتے ہیں، میں منہ تکتا ہوں —— کاش میرا بھی کوئی ساتھی ہوتا —— اور حسین —— تو پھر غم و الم کی کوئی پروانہ تھی جس کی معیت میں کوئی غم میرے لئے غم نہیں رہتا —— لیکن مت بھولنا کہ میں ایک مزدور ہوں اور مزدور کو کوئی حق نہیں کہ اپنے لئے پسندیدہ ساتھی تلاش کرے! —— موسلا دھار بارش ہوتی ہے، اور میں اپنے ٹپکتے ہوئے جھونپڑے میں دونوں ہاتھوں سے دل تھامے بیٹھا رہتا ہوں آہ! ——

"تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم!"

کہیں سے اپنے حسین ساتھی کو پا لیا تھا یا صرف قوتِ متخیلہ کی تخلیق سے دل بہلا رہے ہیں:۔

"اے "فردوس بیگ" —— بہار منظر —— گلستان بکنار و میخانہ بدوش، لہلہاتے ہوئے کنول کے پھول —— اور اس سے

زیادہ کیا کہوں کہ :-

اک بار جس نے دیکھا سو بار آرزو کی

شعر و موسیقی کی اسے زندہ تصویر! کوئی تجھے کس نام سے پکارے مگر میں تو صرف "دیوی" کہا کرتا ہوں۔ ایک "دیوی" کے لئے کسی نام کی ضرورت نہیں۔ تیرے دیوی ہونے میں صرف شیطان ہی شک کر سکتا ہے، تیرے صباحت افروز حسن میں اس درجہ "ملکوتیت" اور اس قدر "سادیت" ہے کہ اہرمن کی آنکھ سے اس جلوۂ مرتعش کے سامنے اندھی ہو جاتی ہے۔ تیری معصوم نگاہیں نفسانیت و مادیت کے خس و خاشاک کے لئے برق خاطف ہیں ———— اسے "یزدان منظر" تیرے آستانہ پر "دین" کی نبضیں ساقط ہو جاتی ہیں، کفر و الحاد تھرتھراتے ہوئے سجدہ میں گر پڑتا ہے۔

اسے "دیوی"! جب میں تیرا تصور کرتا ہوں، تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ نورانی ابر کے سایہ میں ابتسامی لہروں پر سوار فضائے قدس کے اندر پرواز کر رہا ہوں۔ تیرا تخیل جنتی حوروں کے شبنمی پروں کی مروجہ جنبانی اور برساتی راتوں میں ڈھلے ہوئے چاند کی تابناک اور خنک ضیا باری معلوم ہوتی ہے۔

کیا کسی نے پاکیزہ بلور کے ظرف میں کہکشاں و ثریا کے موتیوں کے رسنے اور تسنیم و سلسبیل کے تقاطر کی ملی جلی آہا نہ موسیقی سنی ہے؟ اگر نہیں تو جاؤ اور میری "دیوی" کے گلابی ہونٹوں سے شکر افشاں بول سنکر ناطقہ کو گنگ اور سماعت کو بہرا کر لو، شاعر کے رنگین خوابوں کی اس جیتی جاگتی تعبیر کو دیکھو اور باصرہ سے کھو کر رخصت ہو جائے۔ ایشیائی شاعر کی "جبین نیاز" میں جس کے لئے سجدہ ہائے شوق تڑپتے ہیں، "لباس مجاز" میں یہ وہی حقیقت منتظر ہے۔

اس کے اعضا کی جنبش سے مشرقی نسوانیت کے نغمے برستے ہیں، بدن سے شرم وحیا کی لپٹیں پھوٹ پھوٹ کر عالم کو جھکاتی ہیں رفتار کا جال پُر وقار سکون، اس مست خرام ندی کے مانند ہے، جو شام کے وقت رنگین شفق کا عکس گود میں لئے سبزپوش وادیوں میں آہستہ آہستہ بہتی ہوئی بلندیوں سے دکھائی دیتی ہے۔ اور خواب کی غیر مرئی پریاں اپنے سحر خیز پر اس کے قدموں کے نیچے بچھا دیتی ہیں ——

اپنے لرزشِ تبسم میں سینکڑوں

بہاریں پالتی ہیں چشمانِ میگسار کی سیاہی وسپیدی عبارت ہے تعزیل کے انجام اور صبح بہار کے آغاز سے! —— جب کبھی پلکیں آہستہ آہستہ اوپر اُٹھتی ہیں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کائنات کی مسرت دنیا کی شورش ومستی خواب گراں سے انگڑائی لیتی ہوئی جاگ رہی ہے۔ یا ملکۂ قمر کے روئے روشن سے سیاہ بادلوں کی نقاب سرکائی جا رہی ہے۔

اے "صحیفۂ ازل" کی "وجدانی آیت"! اے پندار نسائیت کے شاہکار!! اے مسجودِ نغمہ ومعبود شاعرا!! میں صرف حسین کہہ کر تیری توہین نہیں کرونگا حسین تو سبھی ہیں، مگر تیرے جمال دلنشین کی تعریف میں:۔

ناطقہ سر بگریباں ہے کہ اب کیا کہیئے!

تیری ضوفشانیوں میں سینکڑوں بت خانوں کی عظمت، اور ہزاروں خانقاہوں کا تقدس پنہاں ہے۔ تو خدائے حسن ہے پروردگارِ عشق ہے۔ تو وہ سب کچھ ہے، جس کے لئے راتوں کی تنہائی میں ایک ادیب کا قلم جنبش کرتا ہے اور ایک شاعر کا دل جس کے لئے اچھلتا ڈوبتا ہے ——

"اے کوثر کی نزہت"! ایک نظر اپنے پر بھی ڈال اور کائنات پر چھا جا!۔

اے " فردوسی نکہت" ! ذرّے منتظر ہیں کہ تیرے حسن عالم افروز کی شعاعوں پر رقص پیہم کریں۔ ساز کے بےچین تاروں میں نغمے تڑپ رہے ہیں کہ تیرے حضور روح غنا کا تحفہ پیش کریں ——— شیشوں میں بند شراب جوش مار رہی ہے کہ تیری مست نگاہوں کے اشارے پر دنیا کو غرقِ تموّج کر دے ——— نیلوفر و لالہ کی لب بستہ کلیاں مغموم ہیں کہ تیری برقِ تبسم پر اپنے سینے چاک کر کے جھومنے لگیں ! ———

ہمہ آہوان صحرا، سر خود نہادہ بر کف
بامید آنکہ روزے، بشکار خواہی آمد!

اب تنقید نگاری میں شاغل کے فرسِ قلم کی جولانیاں دیکھئے۔

" نگار کیا ہے؟ ——— علم و ادب کی بہاروں کا مجموعہ ہے۔ اگر مجھے ذرا بھی موقعہ ملا تو نگار اور " مدینہ " کو براہ راست منگوایا کرونگا۔ موجودہ صحافت میں نگار اور " مدینہ " ہی میرے لئے سب سے زیادہ دلچسپ ہیں۔ میں ان کا مطالعہ بالاستیعاب کرتا ہوں۔ نگار کے موجودہ پرچہ میں ہمارے بھوپال کے محترم ادیب مولانا سید ابو سعید بزمی ایم۔اے۔ نے پھر کسی ہنگامہ خیز اور حشر بدوش عنوان پر مزید روشنی ڈالی ہے۔ اس سے قبل اگست ۳۴ء کے نگار میں اسی عنوان پر ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کر چکے ہیں۔ جس نے تمام ملک میں ایک آگ سی لگا دی تھی۔ مخالف و موافق آرا نے خوب خوب شرر باری کی چند خواتین بھی میدان میں نکل آئیں۔ دہلی کی ایک کسبی اختر ریحانہ نے بھی اپنے اوراق زندگی شائع کر دئے۔ اختر ریحانہ کا ادبی ذوق اور حسیات بہت تیز ہیں۔ زیر نظر فلسفیانہ مقالہ میں مولانا بزمی نے پہلے فلسفہ " خیر و شر " کو ذہن نشین

کرایا ہے "خیر و شر" کے الفاظ بغیر اضافی نسبت کے بے معنیٰ ہیں ——— ایک طویل بحث کے بعد یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کوئی چیز بذاتہ نہ اچھی ہے، نہ بری، ہر وہ چیز جو کسی ایک نقطۂ نگاہ سے مفید ہوتی ہے، دوسرے اعتبارات سے مضرت رسان نظر آتی ہے۔ یعنی نہ دنیا میں کوئی شئے نہ ضرر محض ہے، نہ نفع محض! کسی چیز کا اچھا یا برا ہونا اس کے منافع و مضار کے وقیع ہونے پر منحصر ہے۔

اس کے بعد "جرم" کی فلسفیانہ توجیہہ کرنے کے بعد اس کا تعین نہ کر سکے کہ آیا کسبی کا جرم شخصی ہے یا اجتماعی! کسبی کا جرم شخصی نہ ہونا تو ظاہر ہے، مگر مرد و عورت کے اتصال کے تین اہم اجزاء:-

بقائے نسل

تربیت اطفال

تدبیر منزل

آلام حیات سے آسودگی ——— یا آسودگی نفس میں سے تیسرے اہم جز کی تکمیل کسبی کے ذریعہ ہونے پر اجتماعی جرم بھی نہیں کہا جا سکتا۔ کسبی کی تعریف ان الفاظ میں کیجاتی ہے ——— "کسبی عبارت ہے ہر اس نوجوان عورت سے، جو اپنے حسن ظاہری کے ساتھ فنون لطیفہ سے بخوبی آشنا ہو، جو اٹھنے بیٹھنے اور گفت گو کے آداب سے کما حقہٗ واقف ہو۔ اور جس کی معیت میں انہی امور کی بنا پر مردوں کے لئے بے انتہا کیف ہو۔ عصمت فروشی کسبی کی بارگاہ میں ثانوی حیثیت رکھتی ہے۔ جو کسبیاں ان صفات سے معرا ہیں وہ حقیقتاً آلام حیات سے آسودگی کے اہم مقصد کو انجام ہی نہیں دے سکتیں۔ پھر اس کے بعد ادارۂ کسبی کی ضرورت کو یوں ثابت کیا ہے کہ ہماری بیویاں چونکہ اتصال مرد و زن کے صرف دو اغراض کی تکمیل کے لیئے تیار کیجاتی ہیں، اور تیسری اہم غرض ان سے

پوری نہیں ہوسکتی، اس لئے کبھی کو جو اتصال و مرد و زن کا تیسرا پہلو پیش نظر رکھتی ہے برا نہیں کہا جاسکتا۔

میں خود چونکہ اس خیال کا علمبردار ہوں، اس لئے بزمی صاحب کا مقالہ میرے خیالات کی حرف بحرف تائید کرتا ہے۔ اور میں نے اس کی اشاعت سے بہت پہلے اپنی شادی کے معاملہ پر تنقید کرتے ہوئے ایک صاحب کو خط کے ذریعہ انہی حقائق سے روشناس کرایا تھا۔ مولانا کا یہ مقالہ ہندوستانی نسائیت کے لئے ایک تازیانہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

اتنی سیر حاصل تفصیل کے بعد اب غالباً مطلق گنجائش نہیں کہ مزید اظہار خیال کروں۔ لیکن اس کی زندگی تشنہ رہ جائے گی اگر آخر کے چند سالوں پر ایک اچٹتی نظر نہ ڈالی جائے کہ دراصل تصنیف و تالیف کے یہی چند سال شاغل کو ملے۔

موت سے پندرہ سال قبل ڈاکٹر نے ہدایت کردی تھی کہ لکھنے پڑھنے کا کام کم سے کم کرنا، کیونکہ تمہارے پھیپھڑے اثر پذیر ہوچکے ہیں اور مستقل احتیاط چاہتے ہیں۔ شاغل اس قدر غیر معمولی بہادر نوجوان تھا کہ واقعہ کی اصلیت سے آگاہ ہونے کے بعد بجائے خوفزدہ و محتاط ہونے کے، اس فکر میں مصروف رہنے لگا کہ ذرا اطمینان کی ساعتیں شروع ہوں تو جلد جلد وہ سب کچھ لکھ ڈالوں جن کا موت سے پہلے امکان ہے۔

میں درحقیقت بیحد دیر اعتقادوں میں سے ہوں، اور بڑی مشکل سے کسی کا قائل ہوتا ہوں لیکن شاغل پر بھی کافی دیر اعتقادی کی مشق کرنے کے بعد مجھے ماننا پڑا کہ اس قدر عالم قلم بھوپال نے ایک ہی پیدا کیا تھا۔ بعدہٗ بزمی صاحب کا قائل ہوا جن کے بارہ میں لکھنے کا یہ کوئی موقعہ نہیں۔ لیکن یہ طے ہے کہ بھوپال میں صرف

انھیں دونوں ادیبوں کو ادب کی جملہ شرائط پر پُورا اترا ہوا پایا ــــــــ
چنانچہ شاؔغل کے پسماندہ مسودے اس کی زرخیز دماغی پر دال ہیں اور مجھے حیرت ہوتی تھی کہ وہ ایک ایک صحبت میں کتنی طویل طویل بحثیں ختم کر ڈالتا تھا۔ لکھنے کے معاملہ میں بالکل بھوت کہنا چاہیئے کہ گردن جھکا دی ہے تو کمر سہلانے اور پہلو بدلنے کی بھی خبر نہ لی ــــــــ
شاؔغل کے دورِ مصائب ہی میں ایک وقت وہ آیا کہ بھوپال میں عوامی بیداری کا ترانہ گونجا اور نہ صرف شاؔغل ہی بلکہ اس صف کے جملہ نوجوانوں میں میدان عمل میں اتر آنے کی بے پناہ تحریک ہوئی۔ اور اس آستانہ پر شاؔغل نے فوراً اپنی ملازمت بھینٹ چڑھا دی۔ چونکہ شاؔغل اپنی استعداد و ودیعت کی بنا پر قلم و زبان سے آگے کوئی کام بہتر نہ کرسکتا تھا اس لئے اس نے بعض اخبارات کی ادارت سنبھال لی اور نہایت سلاست روی کی رفتار سے اس خاموش خدمت میں مصروف ہو گیا۔ لیکن خدمت قوم کے چھوٹے ڈھنڈورچیوں نے اس گوہر نایاب کو جس جس طرح قدم قدم پر روندا اور اس کی صلاحیتوں کو صبر آزمائی میں مبتلا کیا وہ انتہائی عبرت انگیز باب ہے۔ جس کو ان سطور میں اس لئے چھیڑنا نہیں چاہتا کہ اس کے جس گوشہ کو سرکایا ــ عفونت کی لپٹیں دماغ کو تہس نہس کردیں گی۔ البتہ ایک واقعہ جس کی المناکی کو تا ایں دم فراموش نہیں کرسکا۔ اس جگہ بطور نمونہ از خروارے درج کرتا ہوں ــــــــ
اکثر اخبارات کے مالک و مدیر چپکے چپکے اس ادیب کی فکر و نگارش کو اپنے ناموں سے چھاپتے رہتے تھے۔ اور از نام اخراجات کچھ معاوضہ دیدیا کرتے تھے۔ ایک ایڈیٹر صاحب نے شاؔغل کو بطور پیشگی ۵۰ دیئے کہ ان کے پرچہ کے کچھ آرٹیکل لکھ دیئے جائیں۔ اخبارات عموماً یہاں بے تاریخ ہوا کرتے تھے، جب

حالات سازگار ہوگئے اشاعت کر دی گئی ورنہ ہفتوں ملتوی ! ——— اس پیشگی والے اخبار کو بھی ہفتے گزر گئے اور آرٹیکل لکھنے کا وقت نہ آیا اور اس عرصہ میں شاغل کو کچھ اور کام مل گیا اور وہ ادھر مصروف ہوگیا۔ اُسے بھروسہ تھا کہ جب ایڈیٹر صاحب تقاضہ کریں گے وہ فوراً ان کا کام بھی نپٹا دیگا۔

اسی عالم میں ایک دن ایڈیٹر صاحب نے بڑی تیزی سے شاغل کی تلاش شروع کی اور جب وہ حسب توقع بیکار نہ ملا تو بایں الفاظ لوگوں میں کہنا شروع کر دیا۔

"میرے روپئے کھا گیا——— یہ دنیا میں کچھ نہ کرسکیگا۔

بس ستم اس واقعہ میں یہ ہے کہ یہ صاحب ایسے نہ تھے جو شاغل کے حالات سے واقف نہوں ورنہ :۔

خندۂ اہل جہاں کی مجھے پرواہ کیا تھی

تم بھی ہنستے ہو میرے حال پہ رونا ہے یہی!

میرے سامنے ذکر آیا تو سفارشاً میں نے عرض کیا :۔

"نجانے کیا صورت حال پیش آگئی ہوگی ورنہ شاغل ان لوگوں میں نہیں جو کسی کو دھوکہ دے اس جیسا غیور ہونا مشکل ہے۔ یہ آپ بہت زیادتی کر رہے ہیں جو ایسا کہتے پھرتے ہیں"

ایک دم بگڑ پڑے :۔

"جی بس دیکھ لی پارسائی ——— وغیرہ وغیرہ"

اور آخر میں ایک فیصلہ بھی صادر فرما دیا :۔

"یاد رکھئے! کردار شناسی آسان نہیں، میں خوب سمجھ چکا ہوں کہ یہ جو کچھ ہیں۔ اور اسی لئے میں یقین سے کہہ سکتا ہوں

کہ یہ دنیا میں کچھ نہیں کر سکتے "

میں نے مکرر عرض کیا :۔

" آپ بیحد زیادتی کر رہے ہیں، رہا کرنے نہ کرنے کا سوال سو یہ یونہی غلط ہوا جاتا ہے کہ ابھی حال ہی میں دہلی کے ایک مشہور ادارہ نے ان کی خدمات طلب کی ہیں۔ اور جب بھی اسے بھوپال سے باہر جانے کا موقعہ ملے گا تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں کیسی کیسی قابلیتیں خوابیدہ تھیں " ——

چمک کر بولے —— " بہر حال میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، دیکھ لیجیگا ! "

بات آئی گئی ہوئی۔ مگر قدرت کے انتقام کے قربان جائے کہ چند ماہ ہی گزرے تھے کہ ان ایڈیٹر صاحب کے ساتھ میں بھی سنٹرل جیل میں مقید تھا۔ وہاں خبر آئی کہ شاغل " مدینہ " کے ایڈیٹر ہو گئے۔ اس سے پہلے " غنچہ " میں ادارت کے فرائض انجام دیتے رہے تھے۔ لیکن " مدینہ " کی ادارت ہمارے ایڈیٹر صاحب کے لئے بہت کشش کا باعث ہوئی۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب انھیں برطانوی ہند کے معزز اخبارات میں اپنی خبروں کی اشاعت ناگزیر معلوم ہو رہی تھی۔ اس لئے یہ بھی بھول گئے تھے کہ کسی وقت وہ شاغل کے بارہ میں کیسی ہتک آمیز گفتگو کر چکے تھے۔ یہ خبر پاتے ہی بے تحاشہ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ اور پوری نیازمندی کے ساتھ بولے :۔

سنا ہے شاغل " مدینہ " میں ایڈیٹر ہو گئے ہیں اور یہ جتنے آرٹیکل آج کل آ رہے ہیں سنا ہے سب انہی کے ہوتے ہیں ۔

میں نے تصدیق کی تو بولے :۔

آپ سے ان کی بڑی اچھی رسم ہے، ذرا اپنے بارہ میں
بھی کچھ ان کو لکھ بھیجئے!"

تھوڑی دیر تک تو میں نے انھیں بغور دیکھا۔ اور اپنے طور سے انھیں وہ تاریخی واقعہ یاد دلانا چاہا مگر جب بھی وہ اس جانب مائل نہ ہوئے تو زیر لب یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو گیا۔

وہ ہم سے کہہ رہے ہیں مری مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے!

البتہ نا انصافی ہوگی اگر شاغل کو فراغت کی جانب بلانے کے لئے مولانا ابو سعید صاحب بزمی ایم۔ اے کا ذکر نہ کیا جائے۔ موصوف اس زمانہ خود "مدینہ" کے چیف ایڈیٹر تھے اور غنچہ کے بھی۔ آپ ہی نے غنچہ کی جگہ شاغل کو منتقل کی اور اس طرح ایک جما جمایا کام سپرد کیا۔ جہاں معاش کی طرف سے آزاد ہوتے ہی شاغل نے دن رات لکھنے پڑھنے کا کام شروع کر دیا تو مرنے کی تاریخوں تک سر نہ اُٹھایا۔

واقعی ڈاکٹر نے صحیح کہا تھا۔ ایک دم مرض نے آکر گردن داب لی اور ہر چند علاج کیا لیکن کمزوری و ناطاقتی بڑھتی ہی گئی تو پہلی مرتبہ ایک طویل چھٹی لے کر گھر آ گیا۔ اور مہینہ ڈیڑھ مہینہ امید و بیم کی حالت میں مبتلا رہنے کے بعد ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں مرض کے شدید جھٹکوں نے جو جرا کر کے رکھ دیا۔ لیکن دیکھنے والی آنکھیں اور سننے والے کان شاہد ہیں کہ اس عالم میں بھی علمی بات چھڑ جاتی تو آواز کی شکستہ بلندی کے ساتھ اس میں شریک ہوتا اور خاص طور پر اس وقت تو چپ ہی نہ رہ سکتا تھا جبکہ کسی غلط خیال کے قائم ہو جانے کا

اُسے اندیشہ پیدا ہو جاتا تھا۔

چنانچہ میرے ہی مواجہ میں اقبال پر ایک نہایت سیر حاصل گفتگو اس نے کی اور اقبال کی صحیح صحیح منزلت کے بارہ میں جس اعتماد و یقین کے ساتھ وہ اپنے عقائد کا اظہار کر رہا تھا اس وقت میری آنکھوں میں وہ تصویر بسی ہوئی ہے کہ کھانسی کو پوری طرح روک، دونوں گھٹنوں کو دونوں بازوؤں میں گتھنے کے بعد وہ تن کر بیٹھ گیا تھا اور سیاہ حلقوں میں بے نور ہو جانے والی آنکھوں میں اقبال کی تصویر کھینچ رہا تھا۔ اللہ اکبر۔

رہے نام اللہ کا!

حرفِ آغاز

تصوراتِ اقبال مرحوم شاغل فخری کے مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ شاغل ایک مدت تک مشہور اخبار مدینہ بجنور کی ادارت کا کام کرتے رہے تھے۔ اور ملک کے بہترین لکھنے والوں میں شمار کئے جاتے تھے افسوس کہ ان کی عمر نے ساتھ نہ دیا۔ اور وہ عین جوانی میں انتقال کر گئے۔ ان کے انتقال سے ہم نے ایک ایسے عالم و ادیب کو کھو دیا جس کی یاد بہت دنوں تک باقی رہیگی۔

یہ مسودات ہمیں مرحوم شاغل کے قریب ترین عزیز اور اپنے کرم فرما جناب حافظ عمران انصاری کی عنایتوں سے ملے۔ عمران صاحب نے ان مسودات کو بڑی محنت سے مرتب فرمایا اور طباعت و اشاعت کے قابل بنایا ہے ہم انکی اس محنت و شوق کے لئے صمیمِ قلب سے شکر گزار ہیں۔ اگر ان میں یہ ذوق نہ ہوتا۔ اور وہ یہ سارا کام اپنے ذمہ نہ لیتے تو شاید یہ کتاب منصۂ وجود پر نہ آسکتی۔

مسودات میں نقل و کتابت کی بہت سی فاش غلطیاں جو نقل نویس کی غفلت سے رہ گئی تھیں۔ ان کیلئے ہم نے اپنے عنایت فرما حضرت علامہ عبد القدوس ہاشمی سے درخواست کی' اور علامہ نے اپنے قیمتی اور انتہائی مشغول اوقات کا کافی حصہ

صرف فرما کر ان کی تصحیح فرمادی۔

"تصورات اقبال" میں شاغل نے اپنے مطالعۂ اقبال کا ماحصل مختلف ابواب میں تقسیم و ترتیب کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اس میں اقبال کے تصورات و افکار کی دلنشین انداز میں تشریح کی گئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے اور اقبال کے کلام کی شہادتوں سے ثابت کیا گیا ہے کہ دنیا کے مختلف مسائل انفرادی و اجتماعی پر علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے کیا خیالات تھے اور وہ خیالات کس سرچشمۂ ہدایت سے سیرابی کے نتائج تھے۔

شاغل مرحوم کی تحریر صاف، واضح اور عالمانہ انداز کی مرتب و مربوط تحریر ہوتی ہے جس میں ایک قسم کا شکوہ اور وقار بھی پایا جاتا ہے۔ مسائل کی ترتیب عموماً منطقی انداز میں کرتے ہیں۔ اور نتائج کو واضح الفاظ میں پیش کرتے ہیں۔

قومیت و بین الاقوامیت کے باب میں انہوں نے علامہ اقبال رح کے خیالات سے اختلاف بھی کیا ہے۔ اس اختلاف کی بنیاد شاغل کے خیالات اور شاید اخبار مدینہ کا ماحول ہو۔ ان کا خیال ہے کہ اقبال نے بین الاقوامیت کی تعلیم ایک ایسی ناپختہ، غلام اور بے اختیار قوم کے سامنے پیش کر دی جس کو اپنے ملکی حالات کی بنا پر صرف قومیت اور وطنیت ہی کے ذریعہ کسی نجات و ترقی کی امید ہو سکتی تھی۔ اگرچہ خود شاغل مرحوم کو بھی یہ تسلیم ہے کہ قومیت و وطنیت کسی طرح انسانیت کیلئے مفید جذبہ نہیں لیکن وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت ہندوستان کے باشندوں میں صرف اسی جذبہ کی پرورش ضروری ہے۔ افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے اس پر توجہ نہ کی کہ یہی دفاعی قومیت جو ہندوستان کی نجات کا ذریعہ بتائی جارہی ہے نجات کے معاً بعد بلکہ نجات کے دوران ہی میں ایک خطرناک ہجومی اور حملہ آور

قومیت بن جائیگی۔ اور بنی نوع انسان کو اس سے انگلستان و فرانس کی قومیت پرستی کی بہ نسبت کم درجہ کا خطرہ نہیں ہوگا ــــ یہ خیال صحیح نہیں، اور محض طفلانہ ہے کہ دنیا کی کوئی قومیت ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر تہجمی اور محض داخلی یا دفاعی امور میں کارفرما رہیگی ــــ اقبال جیسا بالغ نظر انسان جس پر مزاج صبح و شام پوری طرح روشن اور جس کے سامنے مستقبل کا تصور انتہائی وضاحت کے ساتھ موجود تھا اپنی قوم کے سامنے قومیت و وطنیت کے اس زہر ہلاہل کو قند و نبات بتلا کر کیسے پیش کر سکتا تھا ــ کیا اسی نا محمود و نا مسعود جذبۂ قوم پرستی کے تیز ناخنوں سے انسانیت کے قبائے زرتار کی دھجیاں فضاؤں میں اُڑتی ہوئی اسے نظر نہ آرہی تھیں کیا اُسے یہ نہیں معلوم تھا کہ جاپان کی دفاعی قومیت کتنی جلدی تہجمی قومیت بن کر بد نصیب چین کے لئے آفت و مصیبت کا سبب بن گئی۔ اگر خدانخواستہ جزیرہ نمائے ہندوستان کو دو تین آزاد خود مختار مملکتوں میں تقسیم نہیں کیا گیا اور خدا ناکردہ اس پورے جزیرہ نما کی ایک ہی آزاد مملکت تیار ہوگئی تو کتنی جلدی سے یہ مملکت اپنی چالیس کروڑ انسانی آبادی کے ساتھ جو نشۂ قومیت میں سرشار اور خالص انسانی جذبہ سے بے بہرہ ہوگی، ساری انسانی دنیا کے لئے تباہی و بربادی کا سبب بن جائیگی۔ اور کیا خود اس قومی حکومت کا عمل دوسروں کے ساتھ انگریزی حکومت کے ہندوستانی اعمال سے مختلف ہوگا؟

ان سب کے علاوہ اقبال کی نظر اسے اچھی طرح دیکھ رہی تھی کہ انسانیت کا کمال قومیت وطنیت کے زوال کو چاہتا ہے اور وطنیت و قومیت کے کمال کا لازمی نتیجہ انسانیت کی تباہی ہے یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ کسی جماعت کی تربیت قومیت کے اصول پر کرکے اسے بین الاقوامیت و انسانیت کی منزل پر پہنچایا جائے کہ دونوں راستے ایک دوسرے سے بالکل مخالف سمتوں پر جاتے ہیں۔

رہا یہ کہ ہندوستان کی نجات صرف قومیت ہی کے ذریعہ ممکن ہے محض دعویٰ ہی ہے جو شاید کبھی ثابت نہ ہو سکے گا۔ اگر ہندوستان میں قومیت انگریزوں کے پنجہ سے نکلنے کے لئے جدوجہد کرا سکتی ہے۔ تو اس سے زیادہ وسیع جذبہ انسانیت اور مساوات ایسی جدوجہد کا محرک کیوں نہیں ہو سکتا ہے۔

بہر حال! اس ایک جز سے اختلاف کے باوجود ہم یہ سمجھتے ہیں کہ "تصورات اقبال" اقبال اور کلام اقبال کے سمجھنے میں طالبانِ علم کو کافی مدد دے گی۔ اور یقیناً مفید و مقبول ثابت ہوگی۔

"نفیس اکاڈیمی" نے جس کی بیسویں کتاب آپ کے سامنے پیش ہے اس چھوٹی سی مدت میں جسے مہینوں ہی میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ اب تک ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی اور بیش بہا کتابیں پیش کی ہیں۔ اور آج اس کتاب سے اس کی خدمات کی زنجیر میں ایک مزید سنہری کڑی کا اضافہ ہوتا ہے۔ اہل نظر کی توجہ اور پذیرائی نے ہمیں اتنی خدمت کا موقع دیا۔ اور ہمیں امید ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ خدمات کا موقع دے گی۔ وَمَا تَوْفِیْقُنَا اِلَّا بِاللّٰہِ۔

(چودھری) محمد اقبال سلیم گاہندری

پیش لفظ!

بیا بمجلس اقبال و یک دو ساغر کش
اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند!

گو اقبال کا سانحۂ ارتحال تمام دنیا کے لئے بالعموم اور عالم اسلامی کے لئے بالخصوص ایک زبردست حادثہ ہے، جو صدیوں نہیں بھلایا جا سکتا۔ لیکن اس کی "خوشنودی روح" کے لئے اب سب سے اہم فاتحہ خوانی یہی ہے کہ اس کے پیغام کو اوراق کتب سے نکال کر دلوں کے صحائف میں جگہ دیجائے اس کو بیش از بیش سمجھا جائے اور دنیا کو بار بار سمجھایا جائے کہ ترجمان حقیقت اپنی زندگی کی آخری سانس تک کس زندہ و طاقت ور حقیقت کو بے نقاب کرتا رہا ہے تاکہ جس مقصد کے لئے اس نے جگر کاوی کی تھی، وہ حاصل ہو، اور جو راستہ اس نے تیار کیا تھا اس پر قدم پڑنے لگیں۔

اقبال کو سمجھنے سمجھانے کے لئے فکر عمیق اور فرصت طویل کی ضرورت ہے۔ کیونکہ فلسفۂ قدیم و جدید پر پورا پورا عبور رکھنے کے ساتھ خود بھی وہ ایک

زبردست مفکر ہے اور برسوں غور و فکر کے بعد اس نے حیاتِ انسانی کیلئے جو نظریہ پیش کیا ہے وہ تمام تر کلام اللہ کی روشنی میں لکھا ہے۔ اس کے فلسفیانہ نکات جو وجدان و شعریت کی زبان میں ادا ہوئے وہ سب قرآن کی تفسیر اور احادیث کی تشریح ہیں۔ اِس لئے اگر اقبال کو صرف فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو وہ معمہ بن جاتا ہے، اس کے فلسفہ کی پیچیدگیاں سلجھانے کے لئے قرآنی بصیرت کی ضرورت ہے۔ وہ حیاتِ انسانی کو اس بلند ترین نصب العین سے واقف کرنا چاہتا ہے جو قرآن نے متعین کیا ہے۔ اور ہر نئے اسلوب میں وہی کچھ کہتا ہے، جو قرآن نے کہا ہے۔

اقبال کے جہاتِ سخن سے حقیقی طور پر لطف اندوز ہونے کے لئے سب سے پہلے اس کی روشِ فکر کو سمجھنے کی ضرورت ہے "شعر و حکمت" کے باب میں اس کے اندازِ تفکر پر کسی قدر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس مقام پر بھی میں چند الفاظ بطورِ تعارف عرض کر دینا چاہتا ہوں۔

اقبال کے تخیلات کا مرکزی نقطہ "زندگی" ہے۔ اور اس کا تحفظ و ارتقاء اس کے تصورات کا نصب العین ہے۔ وہ موجودات کے حقائق سے آنکھیں نہیں بند کر لیتا۔ بلکہ ان کو بغور دیکھتا، اور زندگی کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ اِس لئے اس کا فلسفہ، عمل کا فلسفہ ہے۔ اور اس کا یہ علم یا فلسفہ ادب خوردۂ دل ہے۔ اور دل کو وہ عشق و وجدان کے زیرِ فرمان رکھتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ علم ہمیشہ عمل کا دست پرور رہا ہے۔ حیات کی پیچیدگیاں محض عقل سے نہیں سلجھائی جا سکتیں۔ عقل کی جولانیوں کے لئے ایک خاص حد مقرر ہے۔ جس سے آگے بڑھنے کے لئے اس کو ایک دوسری زبردست و برتر قوت کی رہنمائی میں چلنا پڑتا ہے۔ جس کو اقبال نے عشق

و وجدان سے تعبیر کیا ہے۔ عقل کی نارسائی اس سے ظاہر ہے کہ انسان کے
جذبۂ شعریت کا ہی وہ آج تک مکمل تجزیہ نہ کر سکی۔ کبھی تو اس کی ہمہ گیری اور
زبردست اثراندازی دیکھ کر اس کو مفید بتاتی ہے۔ اور پھر جب اس کے
حدود کا احاطہ نہیں کر سکتی تو لغو و لایعنی کہہ کر دامن چھڑا لیتی ہے یہی بیچارگی اسکو
روح کے معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اس طرح مذہب کا تعلق بھی عقل سے زیادہ
وجدان سے ہے۔ اگر اس راستہ میں صرف عقل کی مشعل جلائی جائے تو تاریکی
میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اور قدم قدم پر ٹھوکر لگتی ہے۔ مجرد عقل، تشکک
و وسوسہ کی دلدل میں پھنسا دیتی ہے۔ اور عشق و وجدان، یقین و استقامت
کی ٹھوس چٹان پر کھڑا کر دیتا ہے۔ کیفیات قلب کو سمجھنے کے لئے دل ہی کی
روشنی میں آنا پڑتا ہے۔ اور ان کے اظہار کے لئے دل ہی کی زبان درکار
ہوتی ہے۔ اس لئے عقل اسی وقت کامل ہوتی ہے، اور نظارہ کی پریشانی
اسی وقت دور ہوتی ہے کہ نظروں کی ہمراز ہو۔ یہی تصنیف اقبال کا بنیادی
نقطہ ہے۔

اقبال پر لکھنے کا خیال ایک عرصہ سے دل میں تھا۔ جو امروز و فردا پر
ٹل رہا تھا۔ کہ اس کے سانحۂ ارتحال کی خبر میرے اعصاب و حسیات پر ایک
برقی تازیانہ بن کر لگی۔ اور ایک ناقابل ضبط و شدید ترین اندرونی تقاضہ سے
بیتاب ہو کر میں اس طرف متوجہ ہوا اور دو ماہ کی مسلسل کاوش کے بعد ان
صفحات کو پورا کیا۔

شاغل فخری

اشکِ خونیں!

حلقہ بستند سر تربت من نوحہ گراں
دلبراں، زہرہ وشاں گلبدناں سیمبراں (پیام مشرق)

۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کیسی المناک صبح تھی۔ کہ ایک طرف آسمان پر دنیا کا سورج بلند ہو رہا تھا۔ اور دوسری طرف زمین کے اندر مشرق کی عظمت و سعادت کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ دنیا کے لئے یہ بہت ہی جانکاہ حادثہ تھا۔ وہ چیخ اٹھی۔ اور اس کے صبر و ضبط کا کلیجہ پھٹ گیا۔ حسرت کی آنکھ یہ دیکھ کر خوں چکاں ہو گئی کہ عشق کا وہ شعلہ جو صدیوں کی افسردگی کے بعد اقبال کی آہ سحرگاہی و سوزِ نفس سے بھڑک اٹھا تھا، پھر سیاہ پوش ہو گیا۔ جبریل کو پرفشانی سکھانے والا طائرِ لاہوتی عالم آب و گل سے منہ موڑ کر افلاک کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ اور وہ لَے نوازِ حیات دیکھتے ہی دیکھتے فردوسی حوروں کا وجدانی نغمہ بن گیا۔

وہ لب ہائے الوہیت کا ایک لطیف تبسم تھا۔ جس کو کوثر و تسنیم کی

موجوں میں ڈوبا ہوا نطق شیریں اس چمن کی آبیاری کر رہا تھا۔ وہ حیات انسانی کا ایک پیغامبر تھا۔ جس کے سینہ کا مدّ و جزر مشرقی روحانیت کے لیے درس ابدیت، اور مغربی مادّیت کے لئے برق خاطف تھا۔ وہ اسلامیان عالم کا حسان ثانی تھا۔ جو انسانی غیرت و خودی کے لئے غفلت شکن تازیانہ بنا۔ اب کون ہے جو ہم کو افلاک کی سیر کرائے؟ ——— اب کس کے منھ سے ہم ستاروں کا پیغام اور نوریوں کے گیت سنیں؟؟ ——— آہ! اب کس کی زبان میں وہ آتش بیانی ہے جو عرش نشین کے حضور میں ہم خاکیوں کی طرف سے سپاسنامہ پیش کرکے جواب حاصل کرسکے۔ ؟؟؟

حُسن ہمیشہ اس کے لئے تڑپے گا

اور

عشق ہمیشہ سوگوار رہے گا۔

پس از من شعر من خوانند و دریابند و گویند

جہانے را دگرگوں کرد یک مرد خود آگاہے! (پیام مشرق)

ماتم اس کا نہیں کہ اقبال کی رحلت نے شاعری کا دروازہ بند کر دیا۔ بہت سے نغز گو اور شیریں بیان شاعر موجود ہیں۔ اور بہت سے میر و مومن۔ اور غالب و حالی مستقبل کے گہوارہ میں پرورش پا رہے ہیں، دل کی خونچکانی اس لئے ہے کہ جو صدائے ربانی آج خاموش ہوئی ہے۔ وہ مدتوں نہیں بلند ہو گی ——— کہ اس وقت زمانہ کا رجحان دوسرا ہے :-

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

(بانگ درا)

اقبال ہم سے نہیں چھنا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ہم ہی اپنے آپ سے چھن گئے وہ ہم سے ہمارا تعارف کرا رہا تھا تاکہ ہم اپنی طاقتوں سے واقف ہو کر ارض و سما پر چھا جائیں۔ اور کائنات کی پہنائیاں ہماری جولانیوں کے لئے تنگ ہوں۔ دیکھئے کن پرسوز الفاظ میں، ہمارے لئے خدا سے عزم و استقامت کی دولت طلب کرتا ہے:۔

دل مردِ مومن میں پھر زندہ کر دے ۔۔۔ وہ بجلی کہ تھی نعرۂ "لاتذر" میں!
عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے ۔۔۔ نگاہِ مسلماں کو تلوار کر دے!

حسن و عشق کی داستانیں تو ابھی بہت کچھ بیان ہونگیں، لیکن یہ آتشین نعرے اب کون بلند کر سکے گا

فارغ تو نہ بیٹھے گا محشر میں جنوں میرا
یا اپنا گریباں چاک، یا دامنِ یزداں چاک! (بال جبریل)

در دشتِ جنونِ من، جبریل زبوں صیدے
یزداں بکمند آور، اے ہمتِ مردانہ (زبور عجم)

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے، بتا تیری رضا کیا ہے؟ (بال جبریل)

اِسلام و مومن

لفظِ اِسلام سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر
دوسرا نام اِسی دین کا ہے فقرِ غیور! (ضربِ کلیم)

اِقبال پر ایک عام اِعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ بقائے دوام نہیں پا سکتا۔ اِس میں دو بڑی خامیاں ہیں:۔

۱۔ تنگ نظری۔

۲۔ بے عملی۔

"تنگ نظری یہ کہ وہ عام اِنسانیت کو مخاطب کرنے کے بجائے، صرف اِسلام کے محدود و مختصر حلقہ میں گفتگو کرتا ہے۔ اور جو کچھ کہتا ہے عمل سے اس کی تائید نہیں ـــــ بلکہ کردار کی ذمہ داری دوسروں پر ڈال کر خود اس سے آزاد ہے۔ یہ اعتراضات عام طور سے اس طبقہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں جو اقبال کے کلام کو کسی عمیق نظر سے نہیں، بلکہ صرف وقت گزاری کے لئے دیکھتا ہے۔ اور جو روح اِسلامی و تعلیمات قرآنی سے بھی نابلد ہے اس کے بعد

بر عنوان میں پیغامِ اقبال کو قرآن ہی کی روشنی میں دیکھا گیا ہے۔ لیکن مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ ایک طائرانہ نظر اس کی مفروضہ تنگ نظری صدیٔ عملی اور اس کے نقطۂ فکر اسلام پر بھی ڈال لی جائے۔

اقبال کا پیغام صرف مسلمانوں کے لئے نہیں، بلکہ اس کا روئے سخن عام انسانیت سے ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتی ہو۔ وہ کوئی ایسا نظریہ نہیں پیش کرتا جو عملی حیثیت سے ناقابل قبول ہو۔ اس نے اپنے شعر و فلسفہ میں انسانیت کا ایک موثر اور عالمگیر نصب العین پیش کیا ہے اس لئے اس نظریہ کو بروئے کار لانے کے لئے وہ صرف شاعروں اور فلسفیوں کو مخاطب نہیں کرتا، جن کا کام ہر وقت خواب دیکھنا ہے۔ اس کے واسطے ناگزیر ہے کہ وہ انسانوں کی ایک ایسی جماعت کو مخاطب کرے جو اس کے نظریۂ حیات کے ماتحت اس کے عقائد کی حامل اور عمل کی خوگر ہو، اپنے بلند نصب العین اور اپنی قوتِ عمل سے اپنا دائرہ وسیع کرتی رہتی ہو۔ کیونکہ اسی جماعت کو وہ ثبوت میں پیش کر سکتا ہے۔ اور اس پر دلیل لا سکتا ہے۔ اور یہیں سے اس کو اپنے نظریہ کی عملی تائید حاصل ہو سکتی ہے۔ پھر کون انکار کر سکتا ہے کہ ایسا دائرہ اجتماعی دنیا میں صرف اسلام ہے۔ اسی لئے جب اقبال مسلمانوں سے خطاب کرتا ہے تو اس کا روئے سخن تمام انسانوں کی طرف ہوتا ہے۔

خدا کو وہ صرف مسلمانوں کا ہی شفیق نہیں جانتا۔ بلکہ اس کو تمام انسانوں کا پالنے والا سمجھتا ہے۔ خدا کی شفقت و مہربانی میں مسلمان واحد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ وہ ان تمام انسانوں کو بھی اپنے حلقہ میں لے آتی ہے جو سخت کوش اور عمل کی خوگر ہو۔ جو رنگ و نسل اور قومیت و وطنیت کے بتوں کی پرستش سے بلند ہو کر نوعِ انسانی سے محبت رکھتے ہوں۔

اور اغراض و ہوس سے قطع نظر کرکے انسانوں کی بھلائی اور ترقی کے لئے ساعی ہوں:—

یہی آئین قدرت ہے، یہی اسلوب فطرت ہے
جو ہے راہ عمل میں گامزن، محبوب فطرت ہے (بانگ درا)

قرآن نے ملت اسلامیہ کے سامنے ایک صحیح، واضح اور بلند ترین نصب العین رکھ کر اس سے بھی آگاہ کر دیا تھا کہ:۔

وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔ (محمد)

"اگر تم اپنی انسانیت پروری اعمال و کردار کے اعتبار سے بدل جاؤ گے تو اللہ اپنی مہربانی و شفقت کے لئے کسی اور قوم کو منتخب کرکے تمہاری جگہ اس کو بدل لے گا۔ جو تمہاری طرح نہ ہوگی۔"

جب تک مسلمان اس نصب العین کو اپنا فریضۂ حیات بنا کر ارتقائے انسانیت کے لئے سرگرم عمل رہے۔ برابر خدا کے محبوب رہے۔ اور جب انہوں نے اس قرآنی نصب العین کو بھلا دیا، ان کی ترقی رک ہی نہیں گئی؛ بلکہ وہ جہاں تک بڑھ چکے تھے، اس سے بہت پیچھے ہٹ گئے۔ ان کے تنزل و پستی کا راز انکی بے عملی و بے حسی ہے۔ اگرچہ ان کے سجدے بہت طویل، اور ان کے اوراد و وظائف بہت لمبے ہیں۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر (ضرب کلیم)

یہ صحیح ہے کہ اقبال عاشق اسلام ہی کا ہے۔ اور تمام مسائل کو اسی کی روشنی میں دیکھتا ہے۔ کیونکہ دنیا میں اب تک اسلام سے بہتر انسانیت پرور نظام

وجود ہی میں نہیں آیا۔ اسلام سے اقبال کی والہانہ شیفتگی اس لئے ہے کہ وہ سمجھتا ہے
کہ اپنی اصولی نوعیت کے اعتبار سے ملت اسلامیہ ہی اس عالم کی امامت کی سزاوار
ہے۔ اور انسانیت کا ارتقاء اسی ملت کی بیداری و زندگی کا عکس ہے۔ اسلام
صرف روح و معاد اور حشر و نشر کے چند عقائد کے مجموعہ ہی کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ
ایک بہترین اور مکمل معاشری نظام بھی ہے۔ جو اپنے عقائد و دستور کے لحاظ
سے حیاتِ انسانی کے دنیوی رُخ کو ہر جہت سے مکمل اور آراستہ بناتا ہے
مسلمان دنیا میں تعصب اور تنگ نظری کی دلیل بن کر نہیں آیا۔ جیسا کہ بعض کا
خیال ہے، بلکہ وہ امن و آسودگی کو بلا کسی امتیاز کے عام کرنے آیا ہے۔ وہ
انسانیت و مدنیت کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے اور مکمل کرنے آیا ہے۔

اسلام زندگی کے ایک ایسے لچکیلے نظام کا نام ہے، جو فنا نہیں ہو سکتا
وہ فرد اور جماعت دونوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اسلام نہ تو بالکل مادیت کی طرف
انسان کو راغب کرتا ہے، نہ رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ بلکہ اس نے مادیت
اور روحانیت کو اس خوش اسلوبی سے ملایا ہے جو انسان کی فطرت کے عین مطابق
ہے۔ اس طرح اسلامی جماعت میں وہ بے پناہ طاقتِ نمو اور جوشِ حیات پیدا
ہو گیا ہے، اور ایسی لچک آگئی ہے، جو اس کو کبھی فنا نہیں ہونے دیتی۔ وہ
قانونِ قدرت کے مطابق گر گر کر ابھرتی اور پست ہو ہو کر بلند ہوتی ہے۔ اس کا
رکنا یا پیچھے ہٹنا، ایک عارضی وقفہ ہوتا ہے اور پھر زیادہ تیزی سے آگے بڑھ جانے
اور پہلے سے زیادہ اپنے دائرہ کو وسیع کر لینے کا۔ کوئی قوم یہ دعویٰ نہیں کر سکتی
کہ تنہا وہی اسلام کی محافظ ہے بلکہ قدرت نے خود اسی نظام کے اصولوں میں
بقاء و ارتقاء کی ایک ایسی فطری صلاحیت کارفرما کر دی ہے، جو اسلام اور ملت
اسلامیہ کی بقاء کی محافظ ہے۔ جوابِ شکوہ میں اسی کے پیشِ نظر مسلمانوں سے

خطاب کیا ہے:

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلق نہیں پیمانے سے
ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے
کشتیٔ حق کا زمانہ میں سہارا تو ہے
عہدِ نو رات ہے دھندلا سا اجالا تو ہے!

ہے جو ہنگامہ بپا یورشِ بلغاری کا
غافلوں کے لیے سامان ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا
امتحاں ہے ترے ایثار کا خودداری کا
کیوں ہراساں ہے صہیلِ فرسِ اعدا سے
نورِ حق بجھ نہ سکے گا نفسِ اعدا سے!

چشمِ اقوام سے مخفی ہے حقیقت تیری
ہے ابھی محفلِ ہستی کو ضرورت تیری
زندہ رکھتی ہے زمانہ کو حرارت تیری
کوکبِ قسمتِ امکاں ہے صداقت تیری
ختم کب ہے کہ ہوا کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

(بانگِ درا)

یہیں سے اقوامِ عالم کے عروج و زوال کا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر جماعت کے افراد میں جذبۂ خودی مستحکم نہیں اور ملت کا کوئی فطری اور لچکیلا نظام نہیں ہے تو وہ جماعت بہت جلد قومی عصبیت اور احساسِ ذات کو کھو کر یا تو دوسری جماعت کی غلام بن جاتی ہے۔ یا اسی میں ضم ہو کر ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے:۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیرِ اُمم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر! (بالِ جبرئیل)

تاریخِ اسلامی بکثرت اس کی مثالیں پیش کرتی ہے کہ اسلام ہی وہ مذہب انسانیت ہے جو فنا نہیں ہو سکتا۔ وہ ہمیشہ مختلف قوتوں سے برسرِ پیکار رہا اور ہر مرتبہ ٹکرا کر زیادہ بلند ہو تا گیا۔ اس کو نہ تاتاریوں کا فتنہ مٹا سکا، نہ صلیبی یلغاریں اس کی بنیادیں ہلا سکیں:۔

"یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم ویابی اللہ الا ان یتم نورہ ولو کرہ الکافرون" (توبہ)

"یہ نادان اپنی پھونکوں سے اللہ کے نور کو بجھا دینا چاہتے ہیں اور اسلام کو میٹ دینا چاہتے ہیں۔ مگر کسی کے سینہ میں اتنی طاقت نہیں جو پھونک مار کر اس نورِ ہدایت کو بجھا سکے۔ یقین رکھو کہ اللہ اپنے نور کو دنیا پوری طرح روشن کر کے رہے گا۔ اگرچہ یہ تکمیل کفار کو کتنی ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہو۔"

اقبال اسی نظام کا عاشق ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ ملت اسلامیہ زمان، مکان اور رنگ و نسل کی ہر قید سے آزاد ہے، نہ اس کے گرد جغرافیائی حدود کا حصار ہے۔ اور نہ اس کے لئے نہایتِ زمانی ہے۔ وہ ایک ایسی حقیقت ہے

جو ہمیشہ زندہ رہیگی اس کے معارض ہی اس کے زبردست محافظ بن جاتے ہیں ہر آتشِ نمرود کسی نہ کسی خلیل علیہ السلام کے وجود سے گلزار بنتی رہتی ہے۔

از اجل ایں قوم بے پروا ستے — استوار از "نحن نزلنا" ستے!
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است — از دوام او دوامِ ذاکر است
تا خدا "ان یطفئوا" فرمودہ است — از فسردن ایں چراغ آسودہ است
آسماں با ما سرِ پیکار داشت — در بغل یک فتنۂ تاتار داشت
تو اگر از چرخِ کج رفتار پرس — زاں تو آئینِ کہن پندار پرس
آتشِ تاتار را گلزار کیست — شعلہ ہائے او گلِ دستار کیست!
شعلہ ہا در انقلابِ روزگار
چوں بباغِ ما رسد گردد بہار! (رموز بیخودی)

دنیا کے بڑے بڑے تمدن خاک میں مل گئے۔ قوی سے قوی اور فلک سیر قومیں آغوشِ فنا میں جا سوئیں۔ مگر کوئی بات تو ہے کہ صدیوں پہلے جب اللہ کے دو نیک بندوں نے صحرائے عرب کی ایک وادیٔ بے آب و گیاہ میں حلیم و کعبہ کے پتھر چنے تھے وہ آج بھی زندہ و مقبول ہے۔ اس وادیٔ "غیر ذی زرع" سے تیرہ سو سال پہلے جو اذان بلند ہوئی تھی۔ پہنائے عالم میں اس کی گونج آج تک سنائی دے رہی ہے۔ ہماری وقتی افسردگی و دلگیری اس بات کی دلیل نہیں، کہ ہم مٹ جائیں گے ہماری فنا تو اس عالم کی فنا ہے۔ اس کی زندگی و ترقی ہمارے وجود سے وابستہ ہے۔

رومیاں را گرم بازاری نماند — آں جہانگیری، جہانداری نماند!
شیشۂ ساسانیاں در خوں نشست — رونقِ خمخانۂ یوناں شکست
مصر ہم در امتحاں ناکام ماند — استخوانِ او تہِ اہرام ماند!

در جہاں بانگِ اذاں بود است و ہست ملتِ اسلامیاں بود است و ہست

گرچہ مثلِ غنچہ دلگیریم ما

گلستاں میرد اگر میریم ما ! (رموزِ بیخودی)

پھر کس طرح ممکن تھا کہ اقبال جو حیاتِ انسانی کے لئے مذہب کی پیروی کو لازمی و اساسی مسئلہ قرار دیتا ہے، اسلام سے قطع نظر کرلیتا جو انسانیت کا اصلی و فطری مذہب ہے۔ اور رنگ و نسل کی عصبیت کا کامیاب حریف! وہ سچا مسلمان اسی کو سمجھتا ہے جو فطرت و انسانیت کا عاشق ہو۔ اور یہی ایک معیار ہے، اس کی نظر میں کفر و ایمان کا۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی

نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی ہے کافر و زندیق ! (بالِ جبریل)

کافر و مومن کی تعریف و تفریق :-

پوچھ اس سے کہ مقبول ہے فطرت کی گواہی

تو صاحبِ منزل ہے کہ بھٹکا ہوا راہی ! !

کافر ہے مسلماں تو شاہی، نہ فقیری

مومن ہے تو کرتا ہے فقیری میں بھی شاہی

کافر ہے تو ہے تابعِ تقدیر مسلماں

مومن ہے تو وہ آپ ہے تقدیرِ الٰہی

کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسہ

مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

(بالِ جبریل)

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے!
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق! (ضربِ کلیم)

روسو فطرت کا پرستار ہے۔ اور اقبال دینِ فطرت کا عاشق ہے۔ جس چیز کا نام روسو کی زبان میں فطرت ہے، اقبال کے ہاں اسی کا نام اسلام ہے۔ صرف اقبال ہی نہیں ہر وہ صاحب ادراک جس نے مذاہب عالم کا عمیق نظر سے مطالعہ کیا ہے، اسی دینِ فطرت کا شیدائی ہے۔

ذالك الدين القيم ولكنّ اكثر الناس لايعلمون۔

"یہی ہے وہ دینِ قیم اور مذہب فطرت، مگر افسوس ہے ان لوگوں پر جو اس سیدھے راستہ کو نہیں جانتے"۔

مومنِ صادق کی تعریف بجز اس کے کیا ہے کہ اُس کا ہر قدم مظلوم انسانیت کی پشت پناہی و انصاف جوئی کے لئے اُٹھتا ہے؟ وہ کبھی مایوسی و خوفِ شکست سے دوچار نہیں ہوتا۔ وہ حریت کا علمبردار، مادیت سے منھ موڑ کر صرف خلاقِ دوعالم پر بھروسہ کرتا ہے، اور بجز اس کے کسی کے آگے نہیں جھکتا۔ اِس کے سوزِ باطن سے کوئی مادی قوت آنکھ نہیں لڑا سکتی۔ وہ لَا اِلٰہ کی شمشیر سے تمام طاغوتی طاقتوں اور سرکش قوتوں کو خاک و خون میں لتھیڑ دیتا ہے۔ اور اِلَّا اللّٰہ کے دستِ تعمیر سے امن و سکون کے دارالسّلام کا سنگِ بنیاد نصب کرتا ہے:۔

کنتم خیر امةٍ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون بالله۔

(آلِ عمران)

"تم بہترین امت ہو، جس کو دنیا میں اِنسانی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے۔

تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو، اور برائی سے روکتے ہو، اور صرف اللہ پر ایمان ویقین رکھتے ہو۔"

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن! (ضربِ کلیم)

اقبال کی نظر میں مسلمان وہی ہے جو خوددار و خود شناس ہو، جس کے آغوشِ سخت کوشی میں بحر و بر کے طوفان پرورش پاتے ہوں، جس کا تدبر برق و باد کو لگام لگاتا ہو، جو عناصر کا فاتح اور اسرارِ حیات کا رازدار ہو، جو گلستان میں حق و صداقت کی بلبلوں کا ہم صفیر اور بیابان میں بطلان و سرکشی کے عقاب و شاہین کا صیاد ہو۔ جس کا وجود محفلِ بزم کے لئے دل افروز ساز اور میدان رزم کے لئے آہن گداز تلوار ہو، اور جس کے تمام اعمال و اقوال خیر و شر کے لئے حجتِ قاطع ہوں:۔

مومنے بالائے ہر بالا ترے — غیرتِ او برنتابد ہمسرے
می کشد بار دو عالم دوشِ او — بحر و بر پروردۂ آغوشِ او
بر غوِ تندر و مدام افگندہ گوش — برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوش
پیشِ باطل تیغ و پیشِ حق سپر — امر و نہی او عیارِ خیر و شر
ساز او در بزم ہا خاطر گداز — سوزِ او در رزم ہا آہن گداز

در گلستاں با عنادِل ہمصفیر
در بیاباں جرہ بازو صید گیر!

بانگ درا میں بھی ایک جگہ نہایت دلکش انداز میں اسی کی تعلیم دی ہے:۔

تو رازِ کن فکاں ہے اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا رازداں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں میں
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

اگر یہی اقبال کی تنگ نظری ہے، اور یہی وہ محدود حلقہ ہے، جس میں موجودہ زمانہ کی "وسعتِ خیال" سما نہیں سکتی تو اس تنگ نظری پر سینکڑوں بلند پروازیاں قربان اور اس محدود دائرہ پر کائنات کی تمام پہنائیاں صدقے!

اقبال پر تنگ نظری اور تعصب کا الزام لگانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے نہ اقبال کا صحیح مطالعہ کیا ہے اور نہ قرآن کا۔ وہ اقبال کو اسی حد تک سمجھے ہیں جس حد تک مخالفوں نے سمجھنے کی اجازت دی ہے۔ اور اسلام کو انھوں نے وہی جانا ہے جو "مرشدانِ فرنگ" نے بتایا ہے۔ یا تنگ نظر مولویوں اور جاہل صوفیوں نے پیش کیا ہے۔ درآنحالیکہ اقبال خود یورپ کا تعلیم یافتہ ہے۔ وہ نام نہاد مولویوں کے دین سے سخت بیزار رہے ہے جن کے وجود سے دینِ حق، کافری سے زیادہ رسوا و شرمندہ ہے۔ وہ اپنے اغراض کے مطابق ہر طرح سے تاویلیں کرتے رہتے ہیں۔ کبھی قطرہ کو دریا بتاتے ہیں کبھی دریا کو قطرہ۔ وہ حکمتِ دینِ نبی ؐ سے بالکل ناواقف اور بصیرتِ قرآنی سے بے نصیب ہیں۔ ایسے دوستوں سے تو وہ دشمن بہتر ہیں، جن کے فکر و تدبر سے عالمِ انسانیت کو کسی قدر فائدہ پہنچ رہا ہے۔ صرف مسلمان ہی تعلیمات

قرآنی سے غافل رہ کر پستی و ذلت میں ہیں۔ جن اقوام نے اسلام کی روح عمل کو اپنایا ہے، وہ ارتقاء و عروج کی تمام منازل طے کر رہی ہیں، اور خدا ان کو سربلند کر رہا ہے:۔

دینِ حق از کافری رسوا تر است
زآنکہ ملا مومنِ کافر گر است

از شگر فیہائے آں قرآں فروش
دیدہ ام روح الامیں را درخروش

زاں سوئے گردوں دِلش بیگانہ
نزد اُو امّ الکتاب افسانہ

بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی
آسمانش تیرہ از بے کوکبی

دینِ کافر فکر و تدبیر و جہاد
دینِ ملاّ فی سبیل اللہ فساد! (جاوید نامہ)

اب اس کے بعد آسانی سے فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ اقبال کس حد تک بقائے دوام پانے کا مستحق ہے، اور کس حد تک نہیں۔ البتہ اس کی بے عملی کے باب میں اس کے نقاد صحیح ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ صاحب عمل نہو، لیکن صاحبِ نظر ضرور تھا۔ اس کو خدا نے اس مقصد کے لئے تخلیق کیا تھا کہ اسکی کاوشِ فکر چلنے والوں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دے سو وہ ہمارے سامنے ہے:۔

صفتِ برق چمکتا ہے مرا فکرِ بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمتِ شب میں راہی! (بالِ جبریل)

لیکن کیا جہاد بالقلم اور سعی باللسان کوئی معنی نہیں رکھتی؟ ——— کیا اقبال اپنی قوم کو پستی و زبوں حالی میں اسی طرح بسلا دیکھتا رہا' جس طرح ہم دیکھتے رہتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں۔ کیا اس نے شبانہ روز کے غور و فکر سے ایک بلند ترین نصب العین تلاش کرکے قوم کے سامنے نہیں پیش کیا؟ اگر یہ ہے تو پھر اور کونسے عمل کی قوم کو ضرورت ہے؟ ——— کیا یہ انقلابی ہلچل جو اس وقت ہمارے سینوں میں برپا ہے' ایک بے عمل شخص کے افکار انھیں پیدا کر سکتے تھے؟ آج جو ہر آنکھ اس کے لئے خوں فشاں اور ہر سینہ اس کے لئے آہ کشاں ہے تو کیوں؟ ——— کیا یہ اس کی بے عملی کا ماتم ہے یا عمل کی ستائش۔

فطرت ہر شخص کو کسی خاص مقصد کے لئے تخلیق فرمایا کرتی ہے جس پر اگر وہ کاربند ہو جائے تو فبہا اگر منہ موڑے تو ہر ہر قدم ٹھوکریں اس کی تواضع کرتی ہیں ——— خوش نصیب تھا اقبال جس نے اپنے مقصد کو پورا کیا' اس کا سب سے بڑا عمل اور سب سے بہترین عملیت یہی تھی کہ وہ افسردہ سینوں میں حرارتِ عمل اور تھکے ہوئے قدموں میں بہت تیز گامی پیدا کرنے کے لئے اس غیر فانی انداز سے رجز خواں ہوا، کہ شجر و حجر کے دل تک گرما اٹھے۔

موجودات میں انقلاب برپا کرنے والے تو ہر زمانہ میں موجود رہتے ہیں لیکن نفس و روح میں انقلاب پیدا کرنے والا صدیوں میں ایک ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور یہی انقلاب حقیقی انقلاب مانا گیا ہے۔ اقبال کا عمل آج بھی زندہ ہے اور اس وقت تک زندہ رہیگا جب تک ستارے اپنی گردش نہیں بھولے ہیں اور کائنات کا ساز نہیں ٹوٹا ہے ———

اس نے جا بجا خود بھی اِعتراف کیا ہے کہ میرا عمل جو عام طور پر عمل کہا جاتا ہے وہ نہیں ہے۔ اور خدا سے اس عمل کی توفیق عطا کرنے کی دعا کی ہے۔ اِس لئے بھی ہم کو اعتراض سے اعراض کرنا ہی بہتر ہے:۔

عطا اِسلاف کا قلبِ دروں کر　　شریکِ زمرۂ "لایحزنوا" کر!
خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　میرے مولیٰ مجھے صاحب جنوں کر!

(بال جبریل)

روحانیت و مادیت!

لبالب شیشۂ تہذیب حاضر ہے مے لا سے
مگر ساقی کے ہاتھوں میں نہیں پیمانۂ الّا

دبا رکھا ہے اس کو زخمہ ور کی تیز دستی نے
بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا!

(بال جبریل)

دنیا کا کوئی تمدن اور زمانہ کی کوئی تہذیب مسلمانوں سے اس وقت تک سند قبولیت حاصل نہیں کر سکتی۔ جب تک کہ اس تہذیب و تمدن کے بنیادی عناصر اسلامی مواد سے فراہم نہ کئے گئے ہوں۔ کیونکہ اسلام بحیثیت اپنی تکمیل اور ہمہ گیریت کے مسلمانوں کے لئے ایسا سرمایۂ حیات ہے۔ جس سے قطع نظر کر لینے کے بعد مسلمان کچھ نہیں رہتا۔ وہ اسی کی روشنی میں دیکھتا، اسی کے

اصولوں پر سوچا اور اسی کی مقرر کردہ حدود میں قدم بڑھاتا ہے۔ یہ اس کی تنگ نظری نہیں ہے، بلکہ اس کے سامنے اسلامیت کا حلقہ ایسا وسیع حلقہ ہے جس کے اندر ہیئت اجتماعیہ کے تمام حلقے آجاتے ہیں۔ اور خیر و شر کا ایک ایسا معیار ہے جو ہر چیز سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور کہیں غلط رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ مسلمانوں نے خانگی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ میں اس نورِ حق سے ہدایت پائی اور دنیا کو تہذیب و انسانیت کا، عدالت و سیاست کا سبق پڑھایا۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت
علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا (مائدہ)

"آج کے دن تمہارے لئے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا
اور میں نے تم پر اپنا انعام تام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارا
دین بننے کے لئے پسند کر لیا۔"

ثقافت و کلچر کا جہاں تک تعلق ہے، اسلام نے کسی خاص تہذیب و معاشرت کو اپنے لئے مخصوص کرکے اپنے دائرہ کو تنگ نہیں بنایا۔ اس نے کچھ بنیادی اصول تقوے کے وضع کر دیئے ہیں جو ہر تہذیب کو بغیر کسی خاص انقلاب و تخریب کے اپنا لینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے سے بڑے تمدن، ایک مخصوص میعاد کے بعد فنا ہوتے رہے ہیں۔ اور فنا ہوتے رہیں گے۔ لیکن اسلامی تمدن کو فنا چھو نہیں سکتی کیونکہ اسکی تعمیر ہی روح کی تہ ائیوں تک اتر گئی ہے، وہ ظواہر کو چمکانے سے زیادہ بطون میں نفوذ و جلا کرتا ہے۔ عالم محسوسات میں اپنے نشان چھوڑنے سے زیادہ دل و دماغ میں مرتسم ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے کوئی بڑے سے بڑا انقلاب اس تمدن کی جڑیں نہیں اکھاڑ سکتا۔ اور جب ہم

دنیا سے دل و دماغ فنا نہیں ہو جاتے، یہ بھی نہیں مٹ سکتا۔

اسلامی تہذیب کسی خاص ملک و قوم سے وابستہ نہیں۔ بلکہ وہ نام ہے روحانیت و مادیت کے معتدلانہ امتزاج کا۔ جس سے روح پر جلا ہوتی ہے اس کے بعد مادیات سنورتے ہیں۔ اسلامیت حیات انسانی کی مادی تعمیرات کی بنیاد روحانیت کی چٹان پر رکھتی ہے جو زیادہ پائیدار اور انسانیت پرور ہے۔ جس طرح محض روحانیت فطرتِ انسانی کے منافی ہے، اسی طرح ٹھوس مادیت بھی اس کے لئے نقصان رساں ہے۔ اس سے رہبانیت و جمود طاری ہوتا اور زندگی بوجھل ہو جاتی ہے، اور اس سے انسان ایک مشین بن جاتا ہے اور اخلاق کے حسن و قبح کا معیار کھو دیتا ہے۔ لہذا جس تہذیب میں محض روحانیت کے سوا کچھ نہ ہو، نہ وہ اس زمین پر پنپ سکتی ہے اور نہ جس کے تمدن میں مادیت ہی مادیت ہو وہ قائم رہ سکتی ہے۔ بلکہ یہ تو حیاتِ انسانی کو تباہی و بربادی کے ایسے غار کی طرف لیجا رہی ہے۔ جہاں سے اس تمدن و حاملانِ تمدن دونوں کے پھر کبھی نہ ابھرنے کا کھلا منظر اہل نظر کے سامنے ہے ـــــ زندگی کا حقیقی توازن اسی وقت قائم ہوتا ہے جب روح و مادہ میں ہم آہنگی پائی جائے۔ اس لئے ہر وہ تہذیب جس میں یہ امتزاج و لوچ ہو اسلامی تہذیب ہے ـــ

اقبال یورپ کے موجودہ نظریات زندگی سے تعصب نہیں برتتا، وہ اسکی بیداری اور حرکت کو اسلامی تہذیب کی تکمیل سمجھتا ہے۔ جو غرناطہ و اندلس وغیرہ کی راہ سے یورپ پہنچی۔ لیکن وہ جس چیز سے نالاں ہے اور جس کو غیر اسلامی بتاتا ہے وہ یورپ کی ظاہری چمک اور حد سے بڑھی ہوئی مادیت ہے۔ وہ ظواہر کی پرستار اور بطون سے یکسر غافل ہے۔ وہ صرف دماغ پر

جلا کرتی ہے اور دل کو بھول جاتی ہے:۔

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے — حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات
وہ قوم کہ فیضانِ سماوی سے ہو محروم — حد اُس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت — احساسِ مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

(بالِ جبریل)

پھر اقبال اِس ہلاکت آفریں تہذیب کے لئے پیش گوئی کرتا ہے:۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا!

...... وہ مادیت کو عقل سے اور روحانیت کو عشق سے تعبیر کرتا اور دونوں کے امتزاج کی تعلیم دیتا ہے:۔

غربیاں را زیرکی سازِ حیات — شرقیاں را عشق رازِ کائنات
عشق چوں با زیرکی ہمسر شود — نقشبندِ عالمِ دیگر شود

شعلۂ افرنگیاں نم خوردہ است — چشمِ صاحب نظر دل مردہ است
زخمہا خوردند از شمشیرِ خویش — بسمل افتادند چوں نخچیرِ خویش
سوز و مستی را مجو از تاکِ شاں
عصرِ دیگر نیست از افلاکِ شاں! (جاوید نامہ)

اس تہذیب کا دارومدار علم و دانش پر ضرور ہے لیکن یہ علم و دانش ٹھوس مادیت کی پیداوار اور روح کے سوز سے ناآشنا ہے اس عقل فسوں پیشہ کی آندھیوں نے مغرب میں عشق و جنوں کا چشمہ پاٹ دیا ہے۔ ان کی آنکھیں تیز اور روشن ضرور ہیں، لیکن افسردہ و پژمردہ ہیں۔ دماغوں میں تازگی ہے مگر روح سینہ میں

مرجھا چکی ہے۔ اور حسیات مردہ ہو گئے ہیں۔ ان کا علم و دانش انسانیت کی ہڈیوں کو پیس پیس کر سرمہ بنا رہی ہیں۔ یہ انسانی فلاح و بہبود کے بلند و بانگ دعوے اور امن و تہذیب کے فلک شگاف نعرے جو مغربی تمدن کی اونچی اونچی چوٹیوں سے بلند ہو رہے ہیں؛ دراصل استبداد کی آہنی بیڑیوں کی جھنکاریں اور حرص و آز کے خوں آشام تیروں کی بوچھاریں ہیں۔ اقبال خداوندانِ تہذیب مغرب کو ان کی تباہ کاریوں پر کھلے الفاظ میں ٹوکتا اور صحیح راستہ بتاتا ہے۔

از من اے صبا بگو بہ دانایانِ فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق ایں را بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است
عجب آں نیست کہ اعجازِ مسیحا داری — عجب ایں ہست کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دانشِ اندوختہ، دل ز کف انداختہ
آہ زاں نقدِ گراں مایہ کہ در باختہ

عقل چوں پائے دریں راہِ خم اندر خم زد — شعلہ در آب دوانید و جہاں برہم زد
کیمیا ساز کہ او رنگ رواں را زر کرد — بر دلِ سوختہ اکسیرِ محبت کم زد
ہنرش خاک برآورد زِ تہذیبِ فرنگ — باز آں خاک بچشمِ پسرِ مریمؑ زد

چارہ نیست کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گزاریم و مرادے طلبیم (پیامِ مشرق)

دین وسیاست

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو،
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی!
(بالِ جبریل)

مسلمانوں کا دین صرف ان کے سجدوں کی چار دیواری میں محصور نہیں،
وہ دنیا کو دین سے علیحدہ نہیں کرتے۔ بلکہ ان کے دین میں ان کی دنیا پوشیدہ ہے
ان کو دنیا میں ہی دین ملتا ہے۔ اسلام ترک دنیا کی تعلیم دینے نہیں آیا۔ بلکہ اس
زمین پر عدل و انصاف قائم کرنے، امن وسلامتی کا جھنڈا لہرانے اور اس دنیا کو
سنوارنے کے لئے آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب عصر حاضر دین کو سیاست سے
جدا کرتا ہے، تو ایسی بے روح سیاست اقبال کے لئے قابل قبول نہیں رہتی۔ کیونکہ
لادین سیاست وحکومت میں کاغذی عہود و مواثیق اور قوانین و دفعات کی کھوکھلی
بنیادوں پر عدل حقیقی کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اور وہ سیاست صرف چنگیزی کا

بے زنجیر دیو بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن ایمان والوں کے ساتھ خدا کا وعدہ کچھ اور ہے۔

وان تنصروا اللہ ینصرکم و یثبت اقدامکم (محمد)

"اگر تم خدا کے کلمۂ حق کی مدد کروگے (یعنی دنیا کی نظر فریبیوں کے آگے دین کو نہ بھولوگے) تو اللہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ اور تم کو ہر طرح کی استقامت و پائیداری اور سربلندی عطا کرے گا"

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں
کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مُردہ ضمیر!
ہوئی جو ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیوِ بے زنجیر!
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اُن کی
تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسیا کے سفیر! (ضربِ کلیم)

پندرھویں صدی عیسوی میں، اطالوی مورخ و سیاست داں میکیاولی نے "کتاب الملوک" تصنیف کرکے دین و سیاست کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل کر دی۔ اور طاقت و حکومت کے دیو کی تمام زنجیریں کاٹ کر آزاد کر دیا۔ جو بہت سرعت سے تمام دنیا پر چھا گیا۔ زمانۂ حال کے تمام سیاسی مفکرین اسی باطل پرور انسان کی پیروی کر رہے ہیں۔ اور اب یہ دیو مغرب کی فتوحات سے فارغ ہوکر مشرق پر بھی یورش کر رہا ہے۔ اقبال اس آوازِ سیاست پر لعنت بھیجتا اور اس کی تعلیم کو شیطان کی تعلیم بتاتا ہے:۔

دہریت چوں جامۂ مذہب درید — مرسلے از حضرتِ شیطاں رسید
آں فرنگستانی باطل پرست — سرمۂ او دیدۂ مردم شکست
نسخۂ بہرِ شہنشاہاں نوشت — در گِلِ ما دانۂ پیکار کشت

بنگریؔ مانند آذر ششیشہ اش ... بست نقش تازۂ اندیشہ اش
مملکت را دینِ او معبود ساخت ... فکر او مذموم را محمود ساخت
باطل از تعلیم او بالیدہ است
حیلہ اندازی فنے گردیدہ است ... (رموزِ بیخودی)

جب سیاست جامۂ مذہب پارہ پارہ کر دیتی ہے، تو سیاستین کے دماغ پر شیطان قبضہ جمالیتا ہے۔ اور ان کے اخلاق و کردار کی کوئی ضمانت باقی نہیں رہتی:—

تری حریف ہے یارب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس
بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنائے خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس (ضربِ کلیم)

طاقت و حکومت کے منہ زور اور سرکش گھوڑے کو تاخت و تاراج و بے راہ روی سے روکنے کے لئے ایک مضبوط اور خاردار لگام کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ لگام دستور کی نہیں بلکہ دین کی لگام ہے۔ قوت کے دیوتا کے بدن سے اگر دین و مذہب کی زنجیریں کھول دی جائیں تو اس کی ہوسِ خون آشامی ہر لمحہ بڑھتی جاتی ہے۔ اور اس کی شرافشانی کے لئے کوئی پناہ نہیں رہتی۔ پھر وہ لاشوں کے انبار پرست ہو ہو کر ناچتا اور خون کے سمندر میں خوش ہو ہو کر غوطے لگاتا ہے۔ یہ ایک بڑھتا ہوا سیلاب ہے، جس میں عقل و نظر اور علم و ہنر کے مضبوط سے مضبوط بند خس و خاشاک کی طرح بہ جاتے ہیں۔ اس زہر کو تریاق صرف دین کی آمیزش سے بنایا جا سکتا ہے۔

اِنَّ الْمُلُوْكَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْيَةً اَفْسَدُوْهَا

وجعلوا اعزۃ اھلھا اذلۃ۔ (نمل)

" بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ جب وہ کسی آبادی میں فاتحانہ داخل ہوتے ہیں تو اس بستی میں فساد پھیلاتے ہیں، اور اس پر تباہی لاتے ہیں، اور وہاں کے اہلِ عزت کو ذلیل و خوار کرتے ہیں۔"

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرتِ انساں کی قبا چاک!
تاریخ اُمم کا یہ پیامِ ازلی ہے
صاحب نظراں نشۂ قوت ہے خطرناک
اس سیل سبک سیر و زمیں گیر کے آگے
عقل و نظر و علم و ہنر ہیں خس و خاشاک
لادیں ہو تو ہے زہرِ ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر کا تریاک!

(ضرب کلیم)

عقل و دانش، دولت و حکومت انسانیت کا نصب العین نہیں۔ بلکہ اس کا نصب العین حق پرستی ہے۔ اور تمدن کے تمام چشمے اُسی سرچشمۂ فیض سے پھوٹ کر کشتِ حیات کو سیراب کرتے ہیں۔ اگر ان چشموں ہی کو مقصود بالذات مان لیا جائے تو بجز تشنہ کامی اور خزف اندوزی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

ومن کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ ثواب الدنیا والآخرہ۔ (آلِ عمران)

" جو شخص دنیا کی بہتری کا طالب ہے اس کو آگاہ کر دو کہ وہ صرف دنیا کے لئے ہی ہلاک نہ ہو، کیونکہ خدا تو اس کو دنیا و آخرت دونوں کی

بہتری دے سکتا ہے۔ وہ اس کے پاس آئے اور آخرت کے
ساتھ دنیا کو بھی لے لے؟

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نکتۂ ایماں کی تفسیریں (بانگ درا)

بس لئے بس

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر! (بانگ درا)

مسلمان کے لئے اس خامکارانہ اور ہوس پرورانہ طریقہ کی تقلید لائق ستائش نہیں۔ بلکہ حد درجہ شرم و ندامت ہے۔ اس کا تمام فخر اسی میں ہے کہ جہادِ زندگی یا لشکر کا میر سپاہ بھی ہو، اور مسجد میں جماعت کا امام بھی۔ اس کے قدم سے تخت قضا کو بھی رونق ملے، اور اس کا وجود سیاست و تمدن کو بھی فروغ بخشے وہ قرآن کے ساتھ صحیفۂ روزگار کا بھی معلم و مفسر ہو ——— مسلمان اسی وقت تک دنیا میں سربلند رہ سکتا ہے کہ اپنے گلے میں تلوار کے ساتھ قرآن بھی حمائل کرے۔ اس کے ایک ہاتھ میں دین ہو، دوسرے میں دنیا:-

آں مسلماناں کہ میری کردہ اند
در شہنشاہی فقیری کردہ اند (پیام مشرق)

دین کو سیاست سے جدا کرنا تو صرف ان ہی لوگوں کے لئے فخر و مباہات کا باعث ہو سکتا ہے۔ جو اپنے پاس حیاتِ دینوی میں رہنمائی کرنے والا اور زمانہ کی ارتقائی رفتار کا ساتھ دینے والا کوئی مکمل دین نہیں رکھتے اور سیاست کو دین سے علیحدہ کر کے ہوس کے پجاری بنتے ہیں اور اس طرح اپنے ہاتھ خود اپنی اور فطرت کی تضحیک و توہین کرتے ہیں:-

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی — سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصومت تھی سلطانی و راہبی میں — کہ وہ سربلندی ہے یہ سربزیری!
سیاست نے مذہب سے پیچھا چھڑایا — چلی کچھ نہ پیر کلیسا کی پیری!
ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی — ہوس کی امیری، ہوس کی وزیری
یہ اعجاز ہے ایک صحرا نشیں کا — بشیری ہے آئینہ دار نذیری!

اسی میں حفاظت ہے انسانیت کی
کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری! (بال جبریل)

وہ مسلمان جو یورپ کی اس نامحمود اور اندھی روش کی تقلید کر رہے ہیں اور مغرب کی ملمع سازی سے مسحور ہو کر اپنے سونے کو پیتل اور اپنے الماس کو خزف ریزہ سمجھ رہے ہیں، اقبال ان کی بے بصری پر ماتم کرتا اور ان زمین کو تکنے والے آسمان پیوند ہستیوں کو ان کے اصلی مقام سے آگاہ کرتا ہے:۔

سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہمجوار اپنا!
ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب!

(بال جبریل)

ملوکیت و اشتراکیت

نغمۂ بیداریٔ جمہور ہے سامانِ عیش
قصۂ خواب آورِ اسکندر و جم کب تلک؟

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

(بانگ درا)

اقبال ملوکیت کا دشمن اور جمہوریت کا حامی ہے۔ لیکن وہی جمہوریت جس کا خمیر ایمان و حق پرستی سے اٹھایا گیا ہو۔ جس کی بہترین عملی مثال اسلام پیش کر چکا ہے! افلاطون کی مجوزہ جمہوریت کوئی عملی نظام نہیں۔ بلکہ سراسر تخیلی نظریہ ہے۔ اس کے لئے اوراق کتب سے زیادہ موزوں جگہ اس دنیا میں

نکالی بھی نہیں جا سکتی۔ مغرب کے اندر حکومتوں کے مختلف نام نہاد جمہوری نظاموں کو انسانیت و اخوت سے دور کا تعلق بھی نہیں ہے۔ یہ تمام نظام سرتاسر استبدادانہ وسرمایہ دارانہ نظام ہیں۔ اور ملوکیت ہی کی بگڑی ہوئی صورتیں ہیں۔ اس لئے شاہی جس طرح دنیا کے لئے لعنت تھی ویسے ہی یہ بھی ہیں۔ مغربی جمہوریتیں انصاف کے آنکھوں کی پٹی اور جمہور کی ہڈیاں پیسنے کی مشینیں ہیں۔ اور یہ بھی وہ ریشمی جال ہیں، جن کو نہایت بے باکی سے کمزور اقوام پر پھینکا جاتا ہے۔

انقلاب فرانس کا بانی روسو کہتا ہے۔ اس زمین پر حقیقی جمہوریت اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتی، تاوقتیکہ دنیا کے تمام لوگ اعلیٰ تعلیم پاکر تکمیل انسانیت کے تمام مدارج طے نہ کر چکے ہوں ــــــ کیونکہ تمام انسانیت پرور اصول طاقت پاتے ہی استبداد وسرکشی کا علم لہرانے لگتے ہیں۔ ایک عروس کے سینکڑوں اہل کم اور نااہل زیادہ، خریدار پیدا ہو کر ملک میں ہر وقت سازش و بدامنی پھیلاتے رہتے ہیں۔ کمزور اقلیت ہر طرف سے شکنجہ میں کس دی جاتی ہے۔ جو قانون فطرت کے خلاف ہے۔ اور طاقت واثر کے زور پر ایوان میں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے، جو حکمرانی کی صلاحیت اور سیاسی بصیرت سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر شخص کا مقصد تخلیق جداگانہ ہے اور یہ ناممکن ہے کہ سب کے سب سیاسی مسائل میں بصیرت کاملہ حاصل کر لیں۔ اس لئے جمہوریت میں ناقابل اداروں ہی کا غلبہ رہتا ہے پھر فاتحانہ جنگیوں اور فرقہ پرستیوں کا مرکز جس قدر جمہوریت بنی رہتی ہے اس قدر اور کوئی نظام نہیں بنتا ــــــ موجودہ صورت میں اس کا واحد علاج یہی ہے کہ جمہوری حکومت کی بنیاد نیکی اور فطرت پر ہو، ورنہ اس کا طوفان ملوکیت وشاہی سے زیادہ ہمہ گیر

ثابت ہوتا ہے۔

اِقبال اس کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ غیر تربیت یافتہ سینکڑوں دماغ مِل کر بھی اِنسانی فکر و بصیرت کی اس صلاحیت کو نہیں پا سکتے، جو ایک مردِ پختہ کار کا حصہ ہے۔ موجودہ جمہوریت میں افراد کی صلاحتیں نہیں دیکھی جاتیں۔ ان کے دماغوں کو تولا نہیں جاتا، بلکہ صرف بدن گن لئے جاتے ہیں:-

اِس راز کو اِک مردِ فرنگی[1] نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اِسے کھولا نہیں کرتے

جمہوریت اِک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گِنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

(ضربِ کلیم)

اِقبال کے نزدیک حکومت کا کوئی نظام اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا، جب تک کہ سرمایہ پرستی، مادیت اور شخصی اقتدار کے بجائے حق پرستی و روحانیت اور جمہور کے مفاد پر استوار نہ ہو۔ اور اس کے ثبوت میں وہ اِسلام کے دورِ اوّل کے پیش کردہ نظام کو سامنے رکھتا ہے۔ جو دنیا کا کامیاب ترین نظام رہ چکا ہے۔

اِسلام کے نظامِ جمہوریت پر لے دے کر ایک عام اعتراض یہ ہے کہ اس میں قانون جمہور کی رائے پر نہیں بنتا۔ بلکہ دستور شریعت آسمانی ہے۔ اور اس کو نافذ کرنے والے رسولؐ اور آپؐ کے جانشین ہیں۔ اس لئے یہ نظام جمہوری نظام نہیں ہو سکتا —— دراصل یہ مغالطہ میں ڈالنے والی بے نتیجہ بحث ہے۔

---

[1] اِسٹینڈل

اسلام کے بنیادی اُصول یقیناً آسمانی ہیں۔ اور اسی لئے وہ ہوس پرستی واغراض نفسانی سے بلند تر ہوکر وضع کئے گئے ہیں۔ لیکن افراد کی آزادی رائے کو بھی بالکل سلب نہیں کر لیا گیا ہے۔ مابہ النزاع اور پیچیدہ اُمور میں باہم صلاح ومشورہ کا حکم دیا گیا ہے جہاں شخصی اقتدار کے کوئی معنی نہیں رہتے۔ عام جمہوریتوں کے مقابلہ میں اسلام کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ بنیادی اور اہم ترین امور میں احکام الٰہی اور احکام رسالت کے ہوتے ہوئے عوام کی اس سے مختلف الرائے کو کوئی وقعت نہیں دیتا جس میں شخصی اقتدار اور نا اہل اداروں کے غلبہ اور تسلط کے آمیز ہو جانے کا خیال ہو۔ اس نے عوام کو اپنا ایک ذمہ دار اور پرہیزگار حاکم یا صدر منتخب کرنیکی اجازت دی ہے۔ اور اس کی اطاعت واحترام کی تاکید اسی حد تک کی ہے کہ اس کا عمل قرآن کے خلاف نہ ہو۔ اور عوام کو انفرادی و اجتماعی معاملات میں باہمی صلاح ومشورہ کا حکم دیا ہے۔ لیکن اجتماعی ونزاعی مسائل میں شخصی اقتدار کا خاتمہ کرنے کے لئے ان کے اسی فیصلہ کو مستحسن اور قابل عمل بتایا ہے جو احکام الٰہی واحکام نبوی سے زیادہ سے زیادہ قربت رکھتا ہو۔ اور قرآن ہی کی روشنی میں اجتہاد کی اسی صورت میں اجازت دی ہے، جبکہ قرآن وحدیث ان کے کسی مسئلہ میں خاموش ہوں۔ یا ان کو اس وقت ان میں کوئی ہدایت نہ ملتی ہو ۔

یا ایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرّسول واولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیءٍ فردوہ الی اللہ والی الرّسول۔ (نساء)

"مسلمانو! خدا (قرآن) کی اس کے رسول (احادیث)
کی اور اپنے میں سے صاحب امر لوگوں کی اطاعت کرو
اور جب تم میں کسی مسئلہ پر باہم نزاع کی صورت پیدا ہو جائے
تو اس کو صرف خدا اور رسول کے احکام و ہدایت کی روشنی
میں طے کرو۔"

ایک سچے مسلمان کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی گئی ہے:۔

والذین استجابوا لربھم واقاموا الصلوٰۃ
وامرھم شوریٰ بینھم ومما رزقنھم
ینفقون۔ (شوریٰ)

"مسلمان وہی ہیں جو خدا کا حکم مانتے ہیں، نماز پابندی سے
پڑھتے ہیں، اور جن کا کام آپس میں مشورہ کرنا ہے، اور جو
کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے مخلوق کے فائدہ کے لئے
خرچ کرتے ہیں۔"

مشورہ کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ کو بھی
مشورہ کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ جن کی عصمت کا خود قرآن معترف ہے۔

وشاورھم فی الامر فاذا عزمت
فتوکل علی اللہ۔ (آل عمران)

اے محمدؐ! کاموں میں لوگوں سے مشورہ لے، اور مشورہ
کے بعد طے شدہ فیصلہ پر جب عزم کرلے تو پھر کوئی خیال
اپنے دل میں نہ لا اور صرف خدا پر بھروسہ کر کے اٹھ کھڑا ہو۔"

کیا روسو کی جمہوریت اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ——— ؟ پھر

قطع نظر ان تمام باتوں کے موجودہ جمہوریتیں جن میں ملک کے باشندے ہی قانون بناتے ہیں، کیا وہ اِنسانیت کو اس کا نصف مرتبہ بھی دے رہے ہیں جو اسلامی جمہوریت نے دیا ہے؟ ——— اس کی کیا ضمانت ہے کہ ترتیب قانون میں لوگوں کے قلم کی گردش مادی طاقتوں کے اثر اور نفسانی اغراض و ہوس پرستی کی آمیزش سے پاک وصاف رہے گی۔؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے کہ اثر و اقتدار و غرض و ہوس سے بلند ہو کر ہی قانون بنایا گیا ہے تو وہ بجز ایمان کے اور کونسی طاقت ہے جو ان کو اس قانون کے نفاذ پر ہمیشہ کے لئے پابند کردے؟

چنانچہ اقبال نے اپنی حیات آفریں نظم "خضر راہ" میں اسی حقیقت کا اِنکشاف کیا ہے۔ وہ شاہی کی تباہ کاریوں کو گناتا ہوا مغرب کی نام نہاد جمہوریتوں کی ایک ایک دکھتی ہوئی رگ پر انگلی رکھتا ہے اور بتاتا ہے کہ موجودہ نظام، دورِ ملوکیت ہی کے تلخ حقائق کا آئینہ دار ہے۔ یہ قیصریت ہی کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ اور اسی پرانے بھیڑئیے کے ناخن ہیں جن پر اب مخمل و کمخواب کا غلاف چڑھا دیا گیا ہے:۔

"آ بتاؤں تجھ کو رازِ آیۂ اِن الملوک
سلطنت اقوامِ عالم کی ہے اِک جادوگری!

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

نوعِ اِنساں کے لئے سب سے بڑی لعنت ہے یہ
شاہراہ فطرۃ اللہ میں ہے یہ غارت گری

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری!
سروری زیبا فقط اِک ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آذری
از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن
تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری
مجلسِ آئین اصلاح و رعایات و حقوق
طبِ مغرب کے مزے میٹھے اثر خواب آوری
گرمیٔ گفتارِ اعضاءِ مجالس الاماں!
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری (بانگ درا)

یہی وہ موجودہ تمدن کے درندے ہیں، جن کی ہوسِ جمہوریت پر وہ ایک خود آگاہ، پختہ کار اور مردِ حق پرست کی غلامی کو ہمیشہ ترجیح دیتا ہے:—

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی؟
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو
کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید
(پیامِ مشرق)

اور وہ مردِ بخت کار کون ہے؟ ــــ :-

وہ دانائے سبل، ختم الرسل، مولائے کل، جس نے
غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا،
عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں، وہی طٰہٰ!

دنیا کے مروجہ سیاسی مذاہب میں اقبال صرف اشتراکیت کی ہمنوائی اور ہمت افزائی کرتا ہے۔ کیونکہ اصولِ اشتراک ہی نسبتاً اسلام سے زیادہ قریب ہیں۔

اشتراکیت سرمایہ داری کی ضد ہے۔ سرمایہ داری یوں تو دنیا کی قدیم لعنت ہے۔ لیکن اس کے ناخن و چنگال زیادہ تیز اور اس کا جبڑا انتہائی خون آشام ڈیڑھ صدی قبل ہوا۔ یعنی جب یورپ میں جاگیردارانہ نظام شکست ہوا جو سرمایہ داری کا ہی ایک جزو تھا۔ اس کے ٹوٹتے ہی جاگیرداروں نے اپنے پنجۂ استبداد کی گہرائی کو زیادہ ہمہ گیر بنالیا۔ اور بالواسطہ و براہ راست ہر طریقہ سے ان تمام ذرائعِ آمدنی پر بہمہ وجوہ قابض ہوگئے۔ جو پیداوار دولت کے بنیادی ذرائع ہیں۔ یعنی زراعت، صنعت و تجارت، انھوں نے اپنے سرمایہ سے آلاتِ زراعت اور صنعت کی مشینیں بنائیں۔ ان مشینوں سے کم وقفہ اور کم لاگت میں زیادہ مقدار میں، اور قیمتی مال تیار ہونے لگا۔ جس سے تمدن کا پہیہ سرمایہ کی طاقت اور مشین کے بٹے کے ساتھ گردش کرنے لگا اور انسان کی ضروریاتِ زندگی بہت گراں ہوگئیں۔

پیداوار دولت کے ذرائع میں تجارت کا درجہ آخری ہے۔ اور آمدنی

کے اصل ذرائع صرف دو ہیں یعنی زراعت وصنعت، ان دونوں کی پیداوار کے باہمی تبادلہ کا نام تجارت ہے. کسان اور مزدور جو تمدن کی ریڑھ کی ہڈی ہیں، اور زراعت وصنعت کے فروغ وارتقاء میں اور پیداوار دولت میں ارباب ثروت کے برابر کے شریک ہیں. مشینوں کی حکومت میں سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کے مالکوں کے بالکل دست نگر اور محکوم بن گئے ادھر کارخانہ دار اور سرمایہ دار تمام منافع کے واحد اور اصلی مالک بن بیٹھے اور کسان ومزدور کو ان کے حق محنت سے اتنا کم دینے لگے کہ زندگی ان کے لئے عذاب اور دنیا جہنم بن گئی۔ علاوہ ازیں اعلیٰ تجارت کو بھی سرمایہ داروں نے اپنے قبضہ سے باہر نہیں رہنے دیا۔ اور مجالس قانون ساز و حکومت کو بھی اپنے اثر واقتدار میں رکھا بلکہ خود حاکم بن گئے۔

اس طرح جب صرف چند اور مٹھی بھر افراد کی جیبوں میں تمام دنیا سے دولت سمٹ سمٹ کر جمع ہونے لگی، تو "سرمایہ" کا لفظ موجودہ وسیع معانی اس ہمہ گیر مفہوم، اور ان خوفناک و ہلاکت بار نتائج ومطالب کو ساتھ لیکر عالم وجود میں آیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ اس کے مقابلہ اور بیخ کنی کے لئے اس سے زیادہ پراثر، اس سے زیادہ طاقت ور اور اس سے زیادہ انقلاب آفریں لفظ بھی پیدا ہو گیا ــــــــ "اشتراکیت" ــــــــ جس طرح شہنشاہیت کا ردّعمل "قومیت" ہے اسی طرح سرمایہ داری کا ردّعمل اشتراکیت! اشتراکیت سرمایہ کی ضد ہے. جس نے سرمایہ کے تمام مفہوم ومعانی کو الٹ دیا ہے۔ سرمایہ آقا وغلام کی ذلیل ترین تفریق، دولت وثروت کا انجذاب جسم انسانیت کا ناسور، اور تمدن کی دیوار کا روزن ہے۔ اور اشتراکیت موجودہ مستبدانہ وسرمایہ دارانہ نظام کے لئے کامیاب احتجاج! ظالمانہ طاقت

و ثروت کی بیخ کنی۔ انسانیت کی پشت پناہ۔ اور تمدن کی تعمیر و آسودگی ہے۔ ایک دولت و طاقت کی پیداوار ہے۔ اور دوسرا افلاس و بیچارگی کی۔ لیکن طاقت دونوں میں برابر کی ہے۔ بلکہ دوسرے کی طاقت ہر شکر میں پہلے پر غالب آتی جارہی ہے۔ اور دنیا کے ہر خطہ میں سرمایہ و استبداد کے حلقوں کی بنیادیں ہلتی جارہی ہیں۔ ہر حکومت اس انقلاب انگیز غلغلہ پر جھرجھری لیکر چونک اٹھی ہے۔ اور پوری قوت سے اس کا مقابلہ کر رہی ہے۔ لیکن اس کی کوئی تدبیر سوشلزم کے سیلاب کی روک کے لئے کامیاب بند نہیں تیار کر سکی ہے۔ اس لئے اور زیادہ دانت پیستی ہے اور رہ جاتی ہے۔

اشتراکیت کو موجودہ صورت تک آنے کے لئے کئی مراحل طے کرنے پڑے ہیں، اور اس وقت بھی ان میں مختلف العقیدہ جماعتیں ہیں۔ مثلاً سوشلزم (اشتراکی) کیمونسٹ یا نہسٹ (فوضوی) اور نیشنلسٹ (قومی) ان کے جزوی اختلافات پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقعہ نہیں۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ مجموعی طور پر اشتراکیت کا مقصد دنیا میں شخصی اقتدار کا خاتمہ اور عام مساوات پیدا کرنا ہے۔ وہ ذاتی اعزاز و موروثی امتیازات کو مٹا کر دولت و حکومت جمہور کے ہاتھ میں دیدینا چاہتی ہے۔ اور اسی لئے مقبول ہو رہی ہے۔

سرمایہ و استبداد کے سرمدہ عالمگیر طوفانِ ظلمت میں روس کے اندر یہ جو اشتراکیت کے نام پر حریت و مساوات کی ایک چنگاری نظر آرہی ہے۔ اور اسکی روز افزوں تابش سے ساری دنیا لرز رہی ہے اقبال اس کو دیکھکر مسکراتا اور عاملین اشتراک کا خیر مقدم کرتا ہے۔ کیونکہ دنیا کی تاریخ بار بار اس حقیقت کو دہراتی رہی ہے کہ اشتراکی اصول ہر اس نظام کے لئے لازم ہیں جس کی بنیاد انجام بینی اور نیک نیتی پر نہ ہو ——————

وہ حکمتِ ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولانگہ اطلس قبایانِ تتاری ہے
بیا پیدا خریدار است جانِ ناتوانی را
پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانی را (بانگ درا)

دیگر

کشید ابر بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
اگر شاخِ خلیل از خونِ ما نمناک می گردد
بہ بازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد
سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد (بانگ درا)

اس مشینی دور نے مزدور کی جو گت بنا رکھی ہے اقبال اس سے بےحد متاثر ہے۔ مزدور ہی کی زبان میں اپنے قلبی تاثرات کو اس طرح ادا کرتا ہے:۔

ز مزد بندۂ کرپاس پوش و محنت کش
نصیبِ خواجۂ ناکردہ کار رختِ حریر!

ز خونِ من فشانی من لعل خاتم والی
ز اشکِ کودکِ من گوہرِ ستامِ امیرا
ز خونِ من چو زلو فربہی کلیسا را
بزورِ بازوئے من دستِ سلطنت ہمہ گیر
خرابہ رشکِ گلستاں زگریۂ سحرم
شبابِ لالہ و گل از طراوتِ جگرم
بیا کہ تازہ نوا می تراود از رگِ ساز
مئے کہ شیشہ گداز د بہ ساغر اندازیم
مغاں و دیر مغاں را نظام تازہ دہیم
بنائے میکدہ ہائے کہن براندازیم
ز رہزنانِ چمن انتقامِ لالہ کشیم
بہ بزمِ غنچہ و گل طرحِ دیگر اندازیم
بطوفِ شمع چو پروانہ زیستن تا کے؟
ز خویش ایں ہمہ بیگانہ زیستن تا کے؟؟ (پیامِ مشرق)

مزدور سے کہتا ہے کہ اٹھ! اب زمانہ ایک نئی کروٹ بدل رہا ہے، اور وقت کا نقیب تیری فتح کا ڈنکا بجا رہا ہے۔ اس آفتاب کو دیکھ! جو خاک کے ذرّوں کو تابانی جاودیخشش رہا ہے:۔

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا، ہے یہ پیامِ کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دارِ حیلہ گر
شاخِ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات

مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات!

اٹھ! کہ اب بزمِ جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے!

آفتابِ تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک؟

توڑ ڈالیں فطرتِ انساں نے زنجیریں تمام
دوریِ جنت سے روتی چشمِ آدم کب تلک؟

باغبانِ چارہ فرما سے یہ کہتی ہے بہار
زخمِ گل کے واسطے تدبیرِ مرہم کب تلک!

کرمکِ ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو
اپنی ہستی کے تجلی زار میں آباد ہو! (بانگِ درا)

جس طرح سرمایہ داری مزدور کی ہڈیوں سے اپنے محل کی اینٹیں تیار کرتی ہے، اسی طرح زمینداری کسان کی شہ رگ پر جونک کی طرح لپٹی رہتی ہے۔ دونوں استبداد و ملوکیت کے ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں۔ اقبال مزدور کی بربادی پر نوحہ خواں ہونے کے ساتھ، کسان کی بے گور و کفن لاش پر بھی خون کے آنسو بہاتا ہے:—

دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ
بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے

جاں بھی گروِ غیر ہے، تن بھی گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے! (ضربِ کلیم)

وہ مزدور کی کامرانی کی طرح کسان کی آسودگی بھی اشتراکیت میں دیکھتا ہے اور اس کو بھی بیداری اور خودی کا سبق پڑھاتا ہے :-

بتا کیا تیری زندگی کا ہے راز | ہزاروں برس سے توہے خاک باز
زمیں پر ہے گو خاکیوں کی برات | سحر کی اذاں ہوگئی اب تو جاگ
زمانہ میں جھوٹا ہے اس کا نگیں | جو اپنی خودی کو سمجھتا نہیں
بخاکِ بدن دانۂ دل فشاں
کہ ایں دانہ دارد ز حاصل نشاں! (بال جبریل)

"پھر دنیا کے تمام ننگوں اور بھوکوں کی بیداری و زندگی کے لئے آسمان سے فرمانِ خداوندی حاصل کرتا ہے۔ اور اپنے مخصوص الہامی انداز میں جورِ سرمایہ وظلمِ ملوکیت کے خلاف ایک عام دعوتِ انقلاب کا وہ آتشیں صور پھونکتا ہے جس کے ہر زیر و بم میں طوفانوں کا ہولناک شور، لفظ لفظ میں بادلوں کی ہیبتناک گرج اور جس کے ہر ہر نقطہ میں بجلیوں کی زہرہ گداز کڑک چھپی ہوئی ہے۔

اٹھو مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ امراء کے در و دیوار ہلا دو!
گرماؤ غلاموں کا لہو سوزِ یقیں سے
کنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو
سلطانئ جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹا دو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو
تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے | آدابِ جنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو!

اقبال کی یہ اشتراکیت کی ہمنوائی اس لئے نہیں ہے کہ یہ دنیا کے بڑے بڑے مفکرین سیاست کے دماغ کی پیداوار رہے بلکہ اس لئے کہ اس میں اس کے پیغام حیات کی عملیت جھلکتی ہے۔ اور اشتراکی نظام، اسلامی نظام کا کسی حد تک حامل اور اس کل کا ایک جزو ہے۔ اس انقلاب نے جہاں تک اسلامی نظام و انقلاب کا ساتھ دیا ہے، اقبال اس کی نہایت پر زور حمایت کرتا ہے۔ لیکن جہاں سے وہ اسلامی اصولوں، یعنی انسانیت کے اصولوں سے ہٹ کر فطرت کے خلاف گیا ہے، وہ اس کو ہرگز نہیں سراہنا چاہتا۔ بلکہ نہایت صاف اور غیر مبہم الفاظ میں ٹوک دیتا ہے۔

اسلام نے جو مساوات کا نظریہ پیش کیا ہے، اگر عدل و فطرت کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ اشتراکی مساوات سے کہیں بلند ہے۔ جب تک مسلمان اسلام پر پوری طرح عامل و کاربند رہے، مساوات کی آبیاری سے انسانیت سرسبز ہوتی رہی۔ اور جب وہ خود شہنشاہیت کی طرف دوڑ پڑے۔ تو مساوات کے اس نظریہ کو سرمایہ داری و ملوکیت سے ستائے ہوئے افراد نے ذراسی شکل بدل کر اپنا لیا کہ اسلام کی تقلید بھی نہ ہو اور انھیں اپنا مذہب بھی نہ بدلنا پڑے۔ اتفاق سے یہ اسی قوم کے افراد تھے جو اسلام دشمنی میں رسوائے عالم ہیں مگر چونکہ اسلامی جمہوریت اخوت و مساوات کو عملاً ارض اسلام میں سرسبز ہوتے ہوئے دیکھ چکے تھے اسلئے اس لذت سے آشنا رہتے تھے اور باوجود اپنی شدید اسلام دشمنی کے دل سے اس خوبی کے معترف و مقر تھے۔ لیکن اپنی بد باطنی و کور بختی کی بنا پر زبان سے اعتراف و اقرار کرنا نہ چاہتے تھے۔ مگر جب مسلمان خود ہی ملوکیت کے نشہ میں سرشار ہوگئے۔ اسلامی حکومتیں خانہ جنگیوں کا مرکز بن گئیں، دیکھتے ہی دیکھتے سارا شیرازہ بکھر کر رہ گیا تو قدرتی طور پر مخالف عناصر کو موقعہ ہاتھ آگیا۔ اور شہنشاہیت و ملوکیت کے

اس کامیاب نسخہ کو چھوٹے چھوٹے پیمانوں پر خود بھی آزمانے لگے۔ تاآنکہ ایک وقت وہ آیا کہ دنیا تعلیمات اسلامی و شعائر اسلامی کو تو بھول گئی اور کچھ اغیار کی کوششوں سے بھلادی گئی لیکن من جملہ اور خوبیوں کے اسلامی مساوات کو زمانہ نے اپنالیا اور چند مشہور دماغوں نے تراش خراش کر اس کو باضابطہ شکل دی اور عین اس وقت کہ دنیا سرمایہ داری و ملوکیت کے مظالم سے چیخ رہی تھی مظلوم و مقہور اقوام کے سامنے اس کو پیش کر دیا جو اپنی خداداد اثرانگیزی کی بنا پر مشرق سے مغرب تک پھیلتا ہی چلا گیا اور آج سرمایہ داری و ملوکیت کے مقابلہ میں وہ ایک کامیاب و فتحمند حریف کی شکل میں نظر آرہا ہے۔

لیکن نقل پھر نقل تھی اور اصل پر حاوی آنا اس کے لئے آسان نہ تھا چنانچہ اشتراکیت بھی اپنی خامیوں کو سمجھتی جا رہی ہے اور آئے دن مناسب ترمیمیں ہوتی رہتی ہیں۔ پھر بھی اصل تک پہنچنے کے لئے ابھی بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔ جو مستقبل کے ہاتھوں پوری ہوگی یہاں تک کہ "شاہراہ فطرت اللہ" پر بے روک قدم پڑنے لگیں:-

زمانہ ہوش میں لائے گا خود مدہوش انساں کو
ابھی کچھ اور رنگ لینے دو اپنی فرد عصیاں کو!

اسلامیت و اشتراکیت، دونوں کا اصل اصول حریت و مساوات ہے۔ اور ان دونوں میں اسلام اشتراک سے کہیں آگے بڑھا ہوا ہے۔ اشتراک نے انسان کے جسم کو آزاد کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اسلام نے جسم کے ساتھ روح پر حاوی زنجیروں کو بھی کاٹا ہے۔ اسلام نے دل کو آزاد کیا، جسم کی آزادی خود بخود اس ضمن میں واقع ہوگئی —— اسلامی انقلاب کا مرکز عمل "دل" قرار پایا، لیکن اشتراک انقلاب نے اپنا نقطۂ عمل "شکم" کو

ٹھہرایا۔ ظاہر ہے کہ ایک زمانہ کو مطمئن کرنے کے لئے مسئلہ شکم کا حل کافی جاذبیت اپنے اندر رکھتا ہے، لیکن مسئلہ روح اس ذیل میں بے طرح مجروح ہو جاتا ہے جس کی تشریح آگے آئے گی۔

اسلام نے انسانی فطرت کے مطابق مساوات کو زندگی کے مختلف شعبوں کے لحاظ سے مختلف درجوں میں تقسیم کر کے ایک اعلیٰ نظم کی صورت دیدی ہے۔ مثلاً مساواتِ عمومی، مساواتِ نسبی، مساواتِ قانونی، مساوات رتبہ اور مساواتِ مالی وغیرہ۔ ان مختلف مدارج میں اشتراک کی طرح اسلام کا ایک بھی قانون نہیں ہے، بلکہ زندگی کے ہر موڑ پر بے روک چلنے کے لئے اسلام کے قانون میں ایک لچک ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام کا قانون مساوات کسی زیادتی کے ردّعمل کا نتیجہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اور وقتی جذبات سے معرّا ـــــ ایک حقیقت و صداقت ہے، اور حقیقت ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے۔ اس کے اظہار و عمل کے طریقے اگرچہ بدلتے رہیں، مگر وہ تبدیل نہیں ہوتی۔ حقیقت نہ کسی خاص ماحول کے تاثر سے پیدا ہوئی ہے اور نہ حالات کے تغیّر سے بدل جاتی ہے۔ اس لئے اشتراکی انقلاب سے اگرچہ موجودہ تمدن کو کتنا ہی بڑا خطرہ کیوں نہ ہو، مگر اسلام کے پیش کردہ حقیقت کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ کسی اذّی تاثر و انفعال کا نتیجہ نہیں ہے۔ لہٰذا نہ وہ بدل سکتی ہے، نہ مٹ سکتی ہے۔ اس کو نہ کسی طوفان کا خطرہ ہے، نہ کسی انقلاب کا ڈر ـــــ اس مرکز پر آکر ہر طوفان کی سانس رک جاتی ہے اور ہر انقلاب کی آنکھ جھپک جاتی ہے۔ اشتراکیت کا انقلابی بحران جوں جوں کم ہوتا جا رہا ہے وہ اس حقیقت کو سمجھتی جا رہی ہے ـــــ

مساواتِ عمومی میں اشتراکی مساوات ایمان و روحانیت سے

بیگانہ ہے۔ اس لئے خدا کے وجود اور اس کی برتری کی قائل نہیں ہے۔ مگر اسلام نے انسان کے ذوقِ عبودیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تمام طاقتوں اور تمام بڑائیوں سے انکار کر دیا ہے اور صرف ایک برتر و اعلیٰ چوکھٹ پر اس کا سر جھکا دیا ہے

ان الحکم الا للّٰہ (یوسف)

"تمام جہاں میں سوائے اللہ کے کوئی نہیں جس کی حکومت ہو"

اس نے بنی آدم کو بحیثیت انسان کے ایک ہی صف میں رکھا، اور صاف اعلان کر دیا کہ کوئی کسی سے بڑا نہیں، سب ایک نفس واحد سے پیدا کئے گئے ہیں۔ جن کی خلقت میں کوئی امتیاز نہیں۔

یا ایھا الناس انا خلقنا کم من نفس واحدۃ۔ (نساء)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک نفسِ واحد سے پیدا کیا"

لیکن سب سے پہلے اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا تاکہ نفس سرکش قابو میں رہے:-

لَا اِلٰہ اِلَّا اللّٰہ

"دنیا اور آخرت میں کوئی طاقت اور کوئی قہرمانیت نہیں، جس کے آگے سر جھکایا جائے اور جس کی بڑائی تسلیم کی جائے۔ بس ایک خدائے واحد کی ذات ہی ایسی ہے جو ہر طرح کی عظمت و کبریائی کے لائق ہے"

اشتراک و اسلام کا سب سے بڑا اختلاف یہی "پیٹ" اور "دل"

کا اختلاف ہے۔ انسان ایمان سے بیگانہ اور روحانیت سے بے تعلق رہ کر پیٹ بھر جانے پر آسانی سے درندہ بن سکتا ہے، لیکن اخوتِ قلبی ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی ہے۔ خواہ آدمی شکم سیر ہو یا بھوکا ——— اس کو ہر صورت میں اپنے اعمال و اخلاق پر نظر کرنی پڑتی ہے۔ کیونکہ ایک سب سے زبردست طاقت ہر وقت اس کی محتسب و نگران ہے۔ اشتراکیت پہ نفی "لا" کا بحران ابھی اس قدر تیز ہے کہ وہ انسداد ملوکیت و سرمایہ کے بعد فی الحال خدا کی ربوبیت و اثبات کی قائل نہیں ہونا چاہتی۔ اور تمام طاقت صرف حکومت کے ہاتھ میں دیدیتی ہے۔ حالانکہ مادی طاقت پر روحانی طاقت یعنی خدا کی سلطانی کا غلبہ اشد ضروری ہے۔ ورنہ اس پر شیطانی ہوس غلبہ پا لیتی ہے۔ چونکہ انسان کے ضمیر میں انقیاد و اطاعت بھی شامل ہے۔ اس لئے جب وہ معبودِ حقیقی کے آگے سر نہیں جھکاتا تو بہت جلد اپنے ہی ہاتھ سے نئے نئے بت تراش کر مجنونانہ ان کی پرستش کرنے لگتا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جس کو اقبال نے لینن کے افتخارِ اشتراکیت کے جواب میں قیصر ولیم کی زبان سے یوں ادا کیا ہے کہ تم نے جس بُت خانہ کو مسمار کیا تھا، اب پھر نئی تعمیر اس کی بنیادوں پر کھڑی کر رہے ہو ——— ؟ طاقت اگر شخصیت سے نکل کر جمہور کے ہاتھ میں آئی تو کیا ہوا، جمہور کی عقل و قوت کے اعتدال کے لئے تم نے کوئی توازن اور پاسبان نہیں ڈھونڈا ——— ؟! اب اس کی آتشِ ہوس بھی اسی طرح سے بھڑک رہی ہے اور عروسِ اقتدار کی زلف اسی طرح سے پر رونق اور نظر فریب ہے۔ اس تمام کشت و خون میں صرف الفاظ کی ترمیم و تبدیلی تو ہو گئی، مگر حقیقی انقلاب ابھی دور ہے!۔

گنا و عشوہ و ناز بتاں چیست ؟
طواف اندر سرشت برہمن ہست !
دمادم تو خداوندان تراشند
کہ بیزار از خدایانِ کہن ہست !
زجور رہزناں کم گو کہ رہبر
متاعِ خویش را خود راہزن ہست !
اگر تاج کئی جمہور پوشد !
ہماں ہنگامہ ہا در انجمن ہست !
ہوس اندر دل آدم نہ میرد
ہماں آتش میانِ مرزغن ہست !
نماند ناز شیریں بے خریدار
اگر خسرو نباشد کوہ کن ہست ! (پیامِ مشرق)

کارل مارکس کے متعلق کہا ہے کہ گو اس نے مثلِ خلیلؑ اللہ کے بت شکنی کی لیکن ایک نئی قسم کے بت بھی تراش لئے۔ اور حق میں باطل کو ملا دیا۔ اس کا دل تو نفی "لا" میں بیشک مومن ہے، لیکن اثباتِ "الا" میں اس کے دماغ نے کافری کی ——— اس لئے اب اشتراکیت بھی اسی بے نور راستہ پر گامزن ہے، جس سے قلب افسردہ اور روح مضمحل ہوتی ہے۔ ملوکیت بھی اسی راستہ پر چل رہی تھی۔ انسانیت کی موت اس میں بھی ہے اور اس میں بھی دل نہ ملوکیت کے سینہ میں ہے، نہ اشتراکیت کے۔ ملوکیت جسم کی جان نکالتی اور ہاتھ کی روٹی چھینتی ہے، اور اشتراکیت علم و فن اور دین و ایمان پر یورش کرتی ہے:—

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیل
یعنی آں پیغمبرِ بے جبرئیل!
زانکہ حق در باطلِ او مضمر است
قلبِ او مومن دماغش کافر است
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس
بر مساواتِ شکم دارد اساس!
تا اخوت را مقام اندر دل است
بیخِ او در دل نہ در آب و گِل است
ہم ملوکیت بدن را فربہی
سینۂ بے نورِ او از دل تہی
زندگی ایں را خروج آں را خراج
درمیان ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست
آں برد جاں را زِتن ناں را ازِ دست
عقلِ خود بیں غافل از بہبودِ غیر
سوئے خود بیند نہ بیند سوئے غیر
وحی او بینندۂ سود ہمہ
در نگاہش سود و بہبودِ ہمہ! (جاوید نامہ)

ملتِ روس کو پیغام دیتا اور آگاہ کرتا ہے کہ تم نے ملوکیت کے بتوں کو جس استبداد شکن ضرب سے پاش پاش کیا ہے، عین اسلام ہے لیکن

۱؎ کارل مارکس۔

اب اُن بتوں کا نئے انداز پر طواف نہ کرو۔ ورنہ تمہاری ہی طرح تمہارے طلسم کو بھی کوئی موسیٰؑ آکر توڑ ڈالیگا۔ بسلمانوں سے عبرت حاصل کرو، جن کے نعرۂ توحید نے دنیا میں سب سے پہلے قیصریت و شخصیت کے اقتدار کو مٹایا تھا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب وہ قرآن سے غافل ہو کر خود ہی شخصی حکومت کے اس تخت پر بیٹھ گئے تو اپنے لئے اسبابِ زوال کو آپ دعوت دے لی۔ اور اس کا نتیجہ آج دیکھ رہے ہیں۔ کیونکہ دنیا کو تو اس ملت کی ضرورت ہے جو دنیا کے ساتھ دین بھی رکھتی ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں امن و ہدایت کا صحیفہ ہو اور دوسرے میں عدل و انصاف کی تلوار:-

بندۂ مومن ز قرآں برخورد
در ایاغِ روئے او دیدم نہ درد

خود طلسم قیصر و کسریٰ شکست
خود سرِ تختِ ملوکیت نشست

تو کہ طرح دیگرے انداختی
دل ز دستورِ کہن پرداختی!

ہمچو ما اسلامیاں اندر جہاں
قیصریت را شکستی استخواں

تا برافروزی چراغِ در ضمیر
عبرتے از سرگزشتِ ما بگیر!

پائے خود محکم گذار اندر نبرد
گرد ایں لات و ہبل دیگر مگرد

ملتے خواہد ازیں دنیائے پیر
آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر! (جاوید نامہ)

قصرِ استبداد کی زمین گیری کے بعد "لا" کا بحران ختم ہو جانا چاہیئے اور دستِ "اِلّا" سے مدنیت کی تعمیر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ وہ ملت کی ابتدائی منزل ہے جس سے گزر کر انتہا کو پہنچتا ہے:-

نہادِ زندگی میں ابتدا "لا" اِنتہا "اِلّا"
پیامِ موت ہے جب "لا" ہوا "اِلّا" سے بیگانہ!
وہ ملت روح جس کی "لا" سے آگے بڑھ نہیں سکتی
یقیں جانو ہوا لبریز اس ملت کا پیمانہ! (ضربِ کلیم)

تمہارے لئے اِس راستہ میں قرآن سے بہتر ہدایت و رہبری کی اور کوئی شمع نہیں ہو سکتی۔ امن و سلامتی اور اخوت و مساواتِ انسانی کا حقیقی معیار اور نظمِ حکومت و جہانبانی کے عادلانہ اصول اسی صحیفۂ آلہی میں مل سکتے ہیں:-

کردۂ کارِ خداوندان تمام
بگذر از "لا" جانبِ "اِلّا" خرام
دوستانِ کہنہ شستی باب باب
فکر را روشن کن از "ام الکتاب"
با سیہ فاماں یدِ بیضا کہ داد؟
مژدۂ "لا قیصر و کسریٰ" کہ داد؟
جز بقرآں ضیغمی، روباہی است
فقرِ قرآں اصلِ شاہنشاہی است!

فقرِ قرآن "اختلاطِ ذکر و فکر"

فکر را کامل ندیدم جز بذکر! (جاوید نامہ)

مساواتِ نسبی و مساواتِ قانونی میں اشتراکیت نے اسلامیت کا پورا پورا ساتھ دیا ہے۔

امتیازِ رنگ و نسل اور تفریقِ قوم و نسل کا اسلام سخت دشمن ہے اس نے اپنے ہر اصول اور ہر فرع میں اسی لعنت کو مٹایا ہے، اور وہ حدود بتلادی ہیں، جہاں اس امتیاز کا خاتمہ ہو جاتا ہے، اس کی تفصیل دوسرے عنوان میں آئے گی۔ یہاں صرف قرآن کی آیت نقل کی جاتی ہے:-

یا ایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ (حجرات)

"اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کر کے مختلف فرقوں اور قبیلوں میں تقسیم بھی کر دیا، تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو لیکن یہ تقسیم آخری منزل نہیں ہے۔ اور نہ انہیں کسی کے لئے کوئی فخر و مباہات اور فضیلت و بزرگی ہے بلکہ اللہ کے نزدیک تو تم میں سے سب سے زیادہ باعزت وہی ہے، جو امتیازاتِ نسب سے قطع نظر کر کے، اپنے اعمال و اخلاق میں زیادہ پرہیزگار انسان ثابت ہو۔"

مساوات نسبی کی طرح مساوات قانونی پر بھی اسلام جس شدت سے عامل رہا ہے، اس کی نظیر کسی قوم کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ قرآن نے متعدد جگہ اس پر زور دیا ہے، ایک جگہ کہا ہے کہ خبردار! کمزور پر تعزیر میں کوئی زیادتی نہ ہو۔"

فمن اعتدیٰ علیکم فاعتدوا
علیه بمثل ما اعتدیٰ علیکم
فاتقوا الله واعلموا ان الله
مع المتقین۔ (بقر)

"جو شخص تم پر زیادتی کرے، تم بھی اس کے مثل
اس پر زیادتی کر سکتے ہو، لیکن اس سے زیادہ
نہیں۔ خدا سے ڈرو اور یقین رکھو کہ خدا صرف
پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔"

بین الاقوامی تعلقات و کشیدگی میں انصاف کی ہدایت کی ہے:

یا ایها الذین امنوا کونوا قوامین
لله شهداء بالقسط ولا یجرمنکم
منکم شنان قوم علیٰ الا
لا تعدلوا اعدلوا هو اقرب
للتقویٰ۔ (آل عمران)

"اے پیروان دعوت ایمانی! صرف خدا کے واسطے

مستعد اور انصاف کے گواہ رہو، کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی
دشمنی میں تم انصاف کا خون کر ڈالو، ہر حالت میں انصاف
کرو، جو تقوے سے قریب ہے۔"

رشتہ دار اور قومی کے مقابلہ میں قانون و انصاف ہی کے انصاف
کو ملحوظ رکھتا ہے:-

واذا قلتم فاعدلوا ولو کان
ذا قربیٰ۔

"جب بولو انصاف کی بات بولو، اگرچہ تمہارے سامنے
تمہارا کوئی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔"

اسلامی تاریخ قدم قدم پر اپنے ہر قانون اور ہر اصول کی ایک سے ایک
بہتر مساوات کی عملی مثال پیش کرتی ہے جن کو یہاں بخوف طوالت نقل نہیں کیا جاتا
دوسرے کسی عنوان کے ذیل میں کچھ اسناد پیش کر دیجائیں گی۔ اب اشتراکیت
و اسلام کے ابین مساوات، رتبہ و مساوات مالی کی بحث رہ جاتی ہے — —
بحیثیت اولادِ آدمؑ ہونے کے قرآن کے نزدیک سب برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی
ترجیح نہیں۔ حتیٰ کہ رسول اللہؐ سے بھی فرمایا گیا ہے:-

قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الیٰ
انما الٰهکم الٰه واحد۔ (کہف)

"اے رسول! اعلان کر دیجئے کہ میں بھی تمہاری ہی طرح ایک
انسان ہوں اور اس حیثیت سے مجھ کو تم پر کوئی فضیلت
نہیں۔ مجھ میں اور تم میں فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر خدا کی
طرف سے وحی آتی ہے کہ تمہارا تمہارا ماننا ہے وہ آقا صرف

ایک ہی ہے اور وہ خدائے واحد ہے، جو سب سے بزرگ و برتر ہے۔"

لیکن علمی استعداد، دماغی صلاحیت، روحانی قوت، جسمانی محنت اور اخلاقی پاکیزگی کے اعتبار سے انسانوں کے مختلف مدارج ہیں جن کی فضیلت کو قرآن نے تسلیم کیا ہے:۔

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض۔ (بنی اسرائیل)

"دیکھو! کس طرح ہم نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی۔"

اشتراکیت کا یہ اصول تو اسلام کی نظر میں بالکل ٹھیک ہے، کہ اس نے موروثی اعزاز و نسبی فضیلت اور بزرگی دولت وغیرہ کو مٹایا۔ لیکن اس نے آدمیوں کے اعمال و اخلاق اور اوضاع و اطوار کے اختلاف ہوتے ہوئے حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کی کسبی فضیلت کو نہیں سراہا۔ درآں حالیکہ دنیا کے اندر جب تک انسانوں نے اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ وہ عقول و اخلاق اور کردار وغیرہ کے اعتبار سے ایک ہو جائیں، اس وقت تک ان کسبی فضیلت کردار کو تسلیم کرنا پڑے گا۔ علاوہ ازیں تمدنیت کے ارتقاء و ارتفاع کا سنگ بنیاد یہی اختلاف ہے۔ جس روز اوضاع و کردار میں سب ایک ہو گئے تو سمجھ لو کہ دنیا کی ترقی ختم ہو گئی۔ اور اب تمدنیت کی ضرورت نہیں رہی ——— کیونکہ اس وقت لوگوں کو ایک دوسرے سے باہمی امداد کی حاجت نہیں رہے گی:۔

وَرفعنا بعضھم فوق بعض
دَرجات لیتخذ بعضھم بعضاً
سخریاً۔ (زخرف)

" اور ہم نے لوگوں میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی
تا کہ وہ باہم امداد لے سکیں۔ اور ایک دوسرے کے
کام آسکیں "

مساواتِ مالی میں، اشتراکیت کی نفیٔ وراثتِ ارضی، اُصولِ اسلامی کے عین مطابق ہے۔ کیونکہ زمین کے متعلق قرآن کا واضح اعلان یہ ہے کہ وہ بجز خدا کے کسی کی ملکیت نہیں۔ یعنی خدا نے زمین کو لوگوں کے قبضہ و وراثت کے لئے نہیں بنایا بلکہ صرف عوام کے فائدہ کے لئے بنایا ہے:۔

والارض وضعها للانام۔ (رحمٰن)

" زمین کو ہم نے دنیا کے غریب عوام کے لئے بنایا ہے "

لیکن اس وسیع وعریض زمین کو عوام کے فائدہ کے لئے وقف کر دینے کے بعد قرآن اللہ کی بنائی ہوئی اشیاء میں سے جانوروں پر افراد کا حق وراثت و قبضۂ ملکیت بھی تسلیم کرتا ہے:۔

انا خلقنا لهم مما عملت ایدینا
انعاماً فهم لها مالکون۔ (یٰسین)

" ہم نے اپنے ہاتھ کی بنائی ہوئی چیزوں میں سے ان کیلئے
مویشی بنائے جن کے وہ مالک قرار دیئے جاتے ہیں "

نفیٔ سرمایہ میں اسلام اس غیر فطری غلو سے کام نہیں لیتا جو اس وقت اشتراکیت میں کارفرما ہے۔ کیونکہ قرآن نظامِ عائلی کا محافظ و حامی ہے۔ اس لئے وہ سرمایہ کو اس حد تک سوخت نہیں کرتا کہ لوگ قرابت، صلہ رحمی اور حقوقِ ہمسائیگی وغیرہ کی ادائیگی سے قاصر رہ جائیں:۔

وما تنفقوا من شیء فان اللہ بہ علیم (آلِ عمران)

"کبھی نیکی کو نہیں پہنچو گے اور ہرگز فضیلتِ ایثار نہیں
پاؤ گے، جب تک کہ تم اپنی محبوب اشیاء میں سے
اللہ کی راہ میں اس کے بندوں پر خرچ نہ کرو، اور
یاد رکھو کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو، اللہ اس کو خوب جانتا
اور تمہارے ارادوں اور نیتوں کو خوب سمجھتا ہے۔"

علاوہ ازیں اگر انسان اپنی محنت کے ثمرات کا کسی حد تک بھی مالک نہ قرار دیا جائے تو اس میں کام کرنے کا فطری ولولہ و قلبی امنگ اور تعمیر تمدن میں انہماک کس طرح پیدا ہوگا ——— کیونکہ آدمی کی فطرت میں ہوس بھی شامل ہے۔ وہ اسی وقت مطمئن اور خوش ہوتا ہے، اور نئی نئی امنگوں کے ساتھ آگے قدم بڑھاتا ہے جبکہ وہ کسی چیز کے متعلق یہ کہہ سکے کہ "یہ میری ہے!" اس کے بعد اس جذبہ کی تسکین کے لئے نظام تمدن میں کچھ اصول ضرور ہونے چاہئیں، جس سے اس میں اعتدال رہے۔ نہ تو یہ جذبہ مردہ ہونا چاہئے اور نہ اس کو حدِ عدل سے بڑھنا چاہئے۔ اللہ کے لئے تو یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ وہ دولت کے اعتبار سے سب کو برابر کر دیتا۔ لیکن اس نے جس مصلحت سے اوضاع و اطوار اخلاق و کردار، اور دماغ و جسم وغیرہ میں لوگوں کے اندر اختلاف باقی رکھا۔ اس مصلحت سے دولت کا اختلاف بھی باقی رکھا ہے۔ کیونکہ ان چیزوں کے بغیر انسانیت کی تکمیل کب ہوتی۔ اور انسان خلافتِ الٰہی کا وارث کیسے بنتا؟ جبکہ وہ ایثار و قربانی نہ کرتا، اپنے نفس کی مخالف قوتوں پر غالب آنے کے لئے جنگ نہ کرتا، اور ہوس کو دبا کر انسانیت کی خدمت میں انہماک نہ ہوتا؟ ———

اشتراکیت کا فتویٰ ہے کہ جو کچھ لوگوں کے پاس ہے سب لیکر حکومت کو

دیدو۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کی ضروریات کے مطابق چھوڑ دو۔ اور باقی سب لے لو:۔

ویسئلونک ماذا ینفقون قل

العفو کذالک یبین اللہ لکم

الآیات لعلکم تتفکرون

فی الدنیا والآخرۃ (بقرہ)

"لوگوں نے رسول اللہ سے سوال کیا کہ ہم اللہ کی راہ میں کیا اور کتنا خرچ کریں، تو حکم ہوا کہ فرما دیجئے کہ اپنی ضروری احتیاجات سے جتنا زیادہ ہو سب خرچ کر دو۔ یہ خدا کی نشانیاں ہیں، جو وہ تم پر ظاہر کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت پر غور کرو اور حب دنیا میں دین کو فراموش نہ کر دو۔"

اشتراکیت افراد کو معاش اور زندگی کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش کر کے ان کے نظام حیات کی تمام تر ذمہ دار صرف حکومت کو قرار دیتی ہے۔ جس سے ان کی فردیت فنا ہو جاتی ہے۔ اور وہ صرف کام کرنے والی مشین بن جاتے ہیں۔ یہ انسان کی انفرادیت اور انسانیت کا کوئی اعلیٰ معیار نہیں ہے۔ اگر اس کو ہی بہتر کہتے ہو تو پھر نازیت اور فاشیت کو بھی برا مت کہو۔ کیونکہ وہاں بھی لوگوں کی انفرادیت کوئی چیز نہیں۔ وہ صرف مشین کے پرزے ہیں، جسے خواہش استعمال کرنے کی تمام تر ذمہ دار اور صاحب اختیار صرف

حکومت ہے۔

اسلام جہد للبقاء میں افراد کے احسن مسائل کا حکومت کو ذمہ دار بناتا ہے۔ جن کا تعلق ملت کی ہیئت اجتماعیہ سے ہے۔ اور انفرادی و عوائلی معاملات میں بڑی حد تک افراد کو ہی ذمہ دار قرار دیتا ہے۔ تاکہ ان کی دماغی صلاحیتیں فنا نہ ہو جائیں، ترقی کی امنگیں نہ مٹ جائیں، ان کی خود اعتمادی نہ مجروح ہو، ان کے جوش و ولولہ میں کمی نہ آئے، اور بے نتیجہ اور غیر ذمہ دارانہ کام کرتے کرتے زندگی ان کے لئے بے کیف اور اجاڑ نہ ہو۔ وہ اگر کسی وقت جماعت سے ہٹ کر بھی غور کریں اور اپنے آپ پر نظر ڈالیں تو وہی ذمہ داری اور کامیابی نظر آئے جو اجتماعی آنکھ سے دیکھنے میں نظر آتی ہے۔

ذمہ داریاں ہی انسان کو انسان بناتی ہیں۔ وہ شخص جو اپنے کاندھوں پر ذمہ داری کا ہلکا بوجھ بھی نہیں رکھتا وہ انسانیت کے پہلے زینہ تک بھی نہیں پہنچا۔ اس کے کردار میں بغیر اس کے پختگی نہیں آتی۔ انسان کی انفرادی و اجتماعی تمام فضیلت صرف ذمہ داریوں میں پوشیدہ ہے۔ یہی وہ شئے ہے، جو خفتہ صلاحیتوں کو بیدار اور دماغ کو روشن کرتی ہے۔ اس سے عقل پر جلا ہوتی اور فخر کا سر بلند ہوتا ہے۔ ذمہ دارانہ کام کا ایک لمحہ دائمی قیمت نہیں —— جس نے اپنی زندگی میں ذمہ داریاں قبول نہیں کیں، اور ان سے بھاگا، اس کے لئے زندگی ایک عذاب اور ناقابل برداشت دکھ بن جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اصابت رائے سے محروم ہوتا ہے۔ اور ہر ہر قدم پر دوسروں کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ اگر سہارا نہ ملے تو وہ مصائب پر فتح نہیں پاتا۔ اور نہ پیچیدگیوں کو سلجھا سکتا ہے۔ وہ صاف میدان میں بھی نہیں دوڑ سکتا۔ اور پہلے ہی قدم پر سر کے بل گر پڑتا ہے۔ اقبال اسی بیچارگی کو مٹانا چاہتا ہے۔

وہ کہتا ہے کہ بڑھو!! اور دنیا کی تمام ذمہ داریوں کو انگیز لو!! اگرچہ ذمہ دارانہ اقدام بہت خطرناک اور نازک ہوتا ہے لیکن بغیر نزاکت وخطرہ کے کسی نے آسودگی دیکھی ہے ــــ؟ اور کون اس کے بغیر عزت واقبال کے بام بلند پر متمکن ہوا ہے۔؟ جو شخص ایمانداری کے ساتھ جتنا زیادہ ذمہ دار ہے، وہ اتنا ہی باعزت اور مکمل انسان ہے!

اسلام نے ذمہ داری کی نزاکتوں کو سمجھنے کے لئے ہی ہر چیز میں اور ہر جذبہ میں اعتدال کی ہدایت کی ہے۔ اللہ نے انسان کی سرشت میں خیر کے ساتھ شر بھی رکھ دیا ہے۔ اور انہی کی آپس کی کشمکش کا نام زندگی ہے۔ خیر وشر کے اعتدال کا نام نیکی اور انسانیت ہے ــــ عدل داوسط سے ایک بال ادھر اُدھر ہو جانے پر تمام بھلائیاں برائیوں میں اور تمام برائیاں بھلائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح سرمایہ کی بھی ایک خاص حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے زیادہ قرآن کسی کے پاس نہیں رہنے دیتا ــــ وہ لوگوں کو دولت دیتا ہے۔ لیکن ذمہ داری کی اس شدید ترین تاکید کے ساتھ کہ یہ دولت جمع کرنے کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کے ذریعہ تمہارے ہاتھ سے دوسروں کی حاجت روائی ہو ــــ ــ وہ بار بار کہتا ہے خرچ کرو، مگر اسراف سے روکتا اور مسرفین کو اخوان الشیاطین کہتا ہے۔ اسلام نے سود کو حرام کر دیا، تاکہ بغیر محنت کے دولت زیادہ نہ ہو۔ اور لوگ اس کے نقصانات سے بچیں:ــ

واحل اللہ البیع وحرم الربوا۔

" اللہ نے سود کو حرام اور سودے کو حلال فرمایا ہے ــــ"

سود خواروں کو اللہ کا دشمن کہا ہے۔ اور خدا ورسول کی دشمنی کو ان کے ساتھ ظاہر فرمایا ہے:۔

یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ
وذروا ما بقی من الربوا ان کنتم
مؤمنین فأذنوا بحرب من اللہ
ورسولہ۔ (بقر)

"اے مسلمانوں! خدا سے ڈرو، اور جو رقم سود کی
اوروں کے اوپر تمہاری باقی ہے، اس کو چھوڑ دو
اگر تم مسلمان ہو۔ اور اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو جان لو
کہ یہ تمہاری خدا اور اس کے رسول کے ساتھ دشمنی ہے
اور خدا اور اس کے رسول کا تمہارے ساتھ کھلا ہوا
اعلان جنگ ہے"

سود کی طرح رشوت کی بھی ممانعت فرمائی ہے۔ کسب مال کے تمام ذرائع کو نہایت تفصیل کے ساتھ بتلا دیا ہے۔ تجارت کو اللہ کا فضل کہا ہے زراعت وصنعت کی ترغیب دی ہے۔ اور پیداوار دولت کے ان تمام ذرائع کو مردود وملعون قرار دیا ہے، جن میں ذرا بھی دھوکہ اور فریب شامل ہو۔

زکوٰۃ اسلام کے ارکان میں سے ایک اہم ترین رکن ہے۔ اور فرض عین ہے۔ لیکن اس کی فرضیت کی بار بار تاکید فرمائی ہے۔ اور یہ دراصل ان ہی لوگوں کے لئے ہے جو دولت کو بچانے کے لئے قانونی بہانے اور شرعی حیلے ڈھونڈا کرتے ہیں۔ ورنہ فضیلت انفاق میں ہی ہے۔

سود کی حرمت اور زکوٰۃ کی فرضیت کے ساتھ "بیت المال" کے لئے چند محاصل اور بھی عائد فرمائے ہیں:۔

واعلموا انما غنمتم من شئ فان للہ
خمسہ وللرسول ولذی القربٰے
والیتمٰی والمساکین وابن السبیل (انفال)

"جان لو کہ مال غنیمت میں سے جو کچھ تم کو حاصل ہو اس میں سے پانچواں حصہ، خدا، اس کے رسول، اقربا، یتامیٰ اور مساکین اور مسافرین وغیرہ کے لئے ہے"۔

ویذکر اسم اللہ علیٰ ما رزقہم
من بھیمۃ الانعام فکلوا منہا
واطعموا البائس الفقیر۔ (حج)

"اور تاکہ قربانی کرتے وقت اس جانور پر خدا کا نام لو جو خدا نے تم کو دیا ہے۔ اس میں سے خود کھاؤ اور مشقت زدہ فقیروں کو کھلاؤ" وغیرہ وغیرہ ۔۔۔

ان تمام امور کے ساتھ اسلام کا قانونِ وراثت جو جائداد و سرمایہ کو ایک جگہ جمع نہیں ہونے دیتا، بلکہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے اور حصے بخرے کرتا رہتا ہے، مطلب اس تمام بحث کا یہ ہے کہ اصول فطرت کے مطابق اسلام نہ تو سرمایہ کو بالکل سوخت کرتا ہے، اور نہ کسی کو اتنا سرمایہ دیتا ہے کہ وہ موجودہ اصطلاح میں "سرمایہ دار" کہا جا سکے۔ بلکہ اس نے سرمایہ کی ایک خاص

مقرر کر دی ہے، جو اوپر مذکور ہوئی۔

اقبال ان مہات قرآنی کو حل کرتا ہوا نہایت جامع طریقے سے اس اشتراکیت کا نقشہ کھینچتا ہے، جو قرآن کی رو سے قابلِ قبول اور اسلامی اشتراکیت ہے:

چیست قرآں خواجہ را پیغامِ مرگ
دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ!

ہیچ خیر از مردک زرکش مجو
"لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا"

از ربوا آخر چہ زاید جز فتن
کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربوا جاں تیرہ، دل چوں خشت و سنگ
آدمی درندہ بے دندان و چنگ

رزقِ حق را از زمیں بردن رواست
ایں متاعِ بندہ و ملکِ خداست

بندۂ مومن امیں، حق مالک است
غیرِ حق ہر شئے کہ بینی ہالک است

رایتِ حق از ملوک آمد نگوں
قریہ ہا از دخلِ شاں خوار و زبوں

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہائے کاہن و پاپا شکست

اندر تقدیر ہائے غرب و شرق
سرعتِ اندیشہ پیدا کن چو برق

با مسلماں گفت جاں برکف بنہ
ہرچہ از حاجت فزوں داری بدہ
آفریدی شرع و آئینے دگر
اندکے با نورِ قرآنش نگر!
از بم و زیرِ حیات آگہ شوی
ہم ز تقدیرِ حیات آگہ شوی (جاوید نامہ)

اقبال مستقبل کی آغوش میں اشتراکیت کو بار آور دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ موجودہ مہاجنی تمدن، سرمایہ دارانہ حکومت اور مستبدانہ جمہوریت سے بیزار آ چکی ہے۔ وہ اس انقلاب سے مسلمانوں کو آگاہ کرتا اور اس میں حصہ لینے کی دعوت دیتا ہے۔ کیونکہ یہی اشتراکیت چند جزوی تبدیلیوں کے بعد اسلامی مساوات بن جانے والی ہے۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی بے عملی پر افسوس کرتا اور ان کے خدائے واحد سے جدت کردار کی دعا کرتا ہے۔ کیونکہ اشتراکیت نے جو کچھ انقلاب پیدا کیا ہے، وہ دراصل مسلمانوں کا حصہ تھا۔ مگر مسلمان تھوڑے ہی عرصہ تک اس پر عامل رہ کر اس سے غافل ہو گئے۔ اور اللہ نے یہ کام دوسری قوم کے ہاتھ سے کرایا؛ کیونکہ خدا کسی کا محتاج نہیں ہے۔

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار!
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجھ کو
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار
انساں کی ہوس نے جنھیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار

قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار

جو حرف "قل العفو" میں پوشیدہ ہے ابتک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار (ضربِ کلیم)

موجودہ شورش و بیچینی میں اقبال کی عمیق و دوربین نظریں، آنیوالے انقلاب کی کروٹوں کو نہایت واضح طریقہ پر دیکھ رہی ہیں۔ اس کے سامنے ہر ذرّہ، خورشید بن جانے کے لئے تڑپ رہا ہے۔ ہر دانے کے اندر جوشِ نمو بل کھا رہا ہے، وہ کہتا ہے کہ عنقریب ایک صور پھنکنے والا ہے، جو استبداد کے تمام فلک سیر قلعوں اور سرمایہ کے رفیع المنظر پہاڑوں کو روئی کے گالوں کی طرح اُڑا دے گا۔ ایک ایسا سورج طلوع ہو رہا ہے، جو بہت جلد نصف النہار پر پہنچ کر اس سم آلود کہر کو چھانٹ دے گا۔ اور انسانیت کے بام و در مسکرا اُٹھیں گے۔ انقلابِ حقیقت کی یہ چنگاری جو فی الحال مادّیت کے دامن سے ہوا پا رہی ہے، عنقریب روحانیت و قوتِ ایمانی کے جھوکوں سے بھڑک کر تمام دنیا کو خاکستر کر دے گی:-

من دریں خاک کہن گوہر جاں می بینم
چشم ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

دانۂ راکہ بآغوشِ زمین است ہنوز
شاخ در شاخ برومند و جواں می بینم

کوہ را مثلِ پرکاہ سبک می یابم
پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

اِنقلابے کہ نگنجد بضمیرِ افلاک

بینم و ہیچ ندانم کہ چناں می بینم

خرم آں کس کہ دریں گرد سوارے بیند

جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند (پیامِ مشرق)

اپنے ایک اور شاہکار "شمع و شاعر" میں بھی وجد و کیف کے عالم میں اسی خوش انجام اِنقلاب کی نوید سُناتا ہے :-

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش

اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک

یعنی گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی

دیکھ لو گے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل

موجِ مضطر بھی اسے زنجیرِ پا ہو جائے گی

نالۂ صیاد سے ہوں گے نوا ساماں طیور

خونِ گلچیں سے کلی رنگیں قبا ہو جائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی (بانگِ درا)

قومیت و بین الاقوامیت

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی
تو گوئی رومیؔ و افغانیم من
من اوّل آدم بے رنگ و بویم
ازاں پس ہندی و تورانیم من

(پیام مشرق)

اقبال کی شاعری نے منزل بمنزل ارتقائی مدارج طے کئے ہیں۔ اور ہر دور میں وہ اپنے زمانہ سے آگے رہا ہے، جب ہندوستان کی تمام سیاسی تعصب، وفرقہ پرستی اور روز افزوں قومی انتشار کے زہر سے شدید طور پر مسموم ہو رہی تھی، اقبال اس وقت قومیت و وطنیت کے ترانے سنا رہا تھا۔

جو اس وقت تک اپنی جگہ پر مستقل اور موجودہ فضائے قومیت کے لئے حرز جان ہیں :-

اس دور میں اس نے ——— قومی ترانہ ——— نیا شوالہ ——— میرا وطن ——— کوہ ہمالہ ——— بچے کی دعا ——— صدائے درد ——— اور ——— تصویر درد ———

وغیرہ نظموں میں جس جوش و خروش سے اور جس قدر دل نشین طریقوں سے وطن پرستی اور قوم پروری کی تعلیم دی ہے، اس کا اندازہ ذیل کے چند اشعار سے ہو سکتا ہے :-

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی وہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

(بانگ درا)

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے
پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے (بانگ درا)

ہم نے یہ مانا کہ مذہب جان ہے انسانکی
کچھ اسی کے دم سے قائم شان ہے انسانکی
رنگ قومیت مگر اس سے بدل سکتا نہیں
خون آبائی رگِ تن سے نکل سکتا نہیں! (بانگ درا)

لیکن یہ رنگ بہت ہی تھوڑے عرصہ تک قائم رہا، اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں اس نے وطن کی چار دیواری سے نکل کر پہنائے عالم میں قدم رکھا تو اس کی نظر میں زیادہ وسعت ہوئی اور اس کا سینہ زیادہ چوڑا ہو گیا۔ اب وہ قومیت وطنیت کا ساز توڑ کر عالمیت و بین الاقوامیت کے نغمے سنانے لگا۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہندوستان کی آنکھوں پر وطنی تعصب کی پٹی بندھی رہے۔ اور وہ مستقل طور پر اس بت کی پوجا کرتا رہے۔ کہ یہ ہلاکت دنیا کا پیغام ہے۔

اس کی دوررس نظروں نے دیکھ لیا کہ وطنیت کے ظاہری خدوخال کتنے ہی دلکش اور خوشنما کیوں نہ ہوں لیکن اس کا باطن بہت زیادہ تاریک ہے۔ اس کے پیش نظر وہ تمام نتائج تھے، جو یورپ اس نظریہ کے ماتحت بھگت رہا ہے۔ اور ہر قومیت دوسری قومیت کو پھاڑ کھانے پر تلی ہوئی ہے۔ اس لئے اب اس نے اپنی پوری قوت سے اس بت کے سر پر آہنی ضربیں لگانا شروع کیں۔

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں، مٹ جائیگا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر

ہو قید مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزاد وطن صورت ماہی

نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگ مردہ کو موج سراب بھی زنجیر!

مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے!
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے!

وہ کہتا ہے وطن پرستی چھوڑ دو، وطن دوستی اختیار کرو اور اپنے وطن کو دنیا کے نقشہ سے علیٰحدہ مت دیکھو۔ دنیا کے تمام ممالک گویا ایک چمن کے مختلف تختہ ہائے گل ہیں۔ وطنیت کے نام پر اگر کسی حصہ میں ہوس کی آگ بھڑکائی جائے گی تو اس کی لپٹ سے چمن کا کوئی حصہ محفوظ نہ رہ سکیگا۔ انسانیت کا مقام قومیت و وطنیت نہیں بلکہ رشتۂ عالمیت و بین الاقوامیت ہے بحیثیت انسان ہونے کے تمام ابنائے گیتی ہمارے ہم قوم اور تمام دنیا ہمارا وطن ہے۔

قطرۂ از لالۂ حمرا ستے
قطرۂ از نرگسِ شہلا ستے
ایں نمی گوید کہ من از میرم
آں نمی گوید کہ من نیلوفرم!
نہ افغانیم و نے ترک تتاریم
چمن زادیم و از یک شاخساریم
امتیازِ رنگ و بو بر ما حرام است
کہ ما پروردۂ یک نوبہاریم! (پیامِ مشرق)

نہ ہیں عجمی نہ ہندی نہ عراقی و حجازی
کہ خودی سے میں نے سیکھی دو جہاں سے بے نیازی
تو مری نظر میں کافر میں تری نظر میں کافر
ترا دیں نفس شماری، مرا دیں نفس گدازی
ترے دشت و در میں مجھ کو وہ جنوں نظر نہ آیا
کہ سکھا سکے خرد کو رہ و رسم کارسازی
نہ جدا رہے اگر تو تب و تابِ زندگی سے
کہ ہلاکئی امم ہے یہ طریق نے نوازی! (ضرب کلیم)

حبِ وطن کے فطری جذبے سے وہ منکر نہیں ہے۔ اس کو بھی اپنے وطن سے بے حد محبت ہے۔ چنانچہ اس بین الاقوامیت کے دور میں بھی جب وہ اپنے وطن کا تذکرہ کرتا ہے تو اس کے ایک ایک لفظ سے حبِ وطن کا پاک و فطری جذبہ امنڈا پڑتا ہے اسی طرح وطن کے مصائب پر اس کا دل خون کے آنسو رونے سے باز نہیں رہتا۔ فلکِ زحل میں مادرِ وطن، پیکرِ حسن و معصومیت بن کر اس کے سامنے آتی ہے، اور وہ اس نظارۂ سعید کا نقشہ بیحد پُرکیف اور انتہائی پُرشوق الفاظ سے کھینچتا ہے:۔

آسمان شق گشت و حورے پاک زاد
پردہ را از چہرۂ خود بر کشاد
در جبینش نار و نورِ لایزال
در دو چشم او سرورِ لازوال
حلۂ او را ستبک تر از سحاب
تار و پودش از رگِ برگِ گلاب (جاوید نامہ)

آسمان شق ہوا اور ایک مقدس و معصوم ترین حور نے نمودار ہو کر اپنے نورانی چہرہ سے نقاب سرکائی۔ اس کی پیشانی ایک غیر فانی نور سے چمک رہی تھی۔ اور اس کی آنکھیں سرور جاودانی سے مسکرا رہی تھیں ـــــ تن نازک پر لباس اتنا سبک تھا کہ ابر کو شرما رہا تھا۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے تار و پود گلاب کی پنکھڑیوں کی باریک رگوں سے بنائے گئے ہیں۔

لیکن یہ رعنائی کا مجسمہ غلامی کی زنجیروں میں بےطرح جکڑا ہوا ہے اور جب وہ اس کو اس قید و بند کے عالم میں دیکھتا ہے اور اس کی آہ جگر دوز اور نالۂ دردناک کو سنتا ہے، تو اس کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے اور مولانائے رومؒ اس کو بتاتے ہیں کہ یہ روحِ ہند ہے:۔

با چنیں خوبی نصیبش طوق و بند
برلب او نالہ ہائے درد مند
گفت رومی روحِ ہنداست این نگر
از فغانش سوزہا اندر جگر! (جاوید نامہ)

اس کے بعد روحِ ہند کی فریاد کو اس نے جس انداز پر نظم کیا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں ناسور پڑ گئے تھے جو اس راہ سے برس رہے ہیں۔ اور آنکھیں خون برسا رہی ہیں۔ وہ غدارانِ وطن صادق و جعفر کو نہایت ہولناک مقام میں دیکھتا ہے، اور انتہائی غم و غصہ کے عالم میں اُن کو ـــــ آدمیت کی ذلت ـــــ دین کی خجالت ـــــ اور وطن کی لعنت کہتا ہے۔

ایک جگہ سورج کی ایک کرن کی زبان سے ہندوستان کی حقیقی عظمت و شان کا ذکر کرتا ہے، اور اس طرح اس کے تابناک ماضی پر روشنی

ڈالتا ہے:۔

چھوڑوں گی نہ میں ہند کی تاریک فضا کو
جب تک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ دُرِ ناب!
اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواصِ معانی
جن کے لئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب! (ضربِ کلیم)

اس کے بعد ہندیوں کی موجودہ غفلت و ذلت پر ماتم کیا ہے۔

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں
محفل کا وہی ساز ہے بیگانۂ مضراب! (ضربِ کلیم)

اور آخری شعر میں حبِّ وطن اور اخوتِ عامّہ کی تعلیم دی ہے:۔

مشرق سے ہو بیزار، نہ مغرب سے حذر کر
فطرت کا اشارہ ہے کہ ہر شب کو سحر کر! (ضربِ کلیم)

ہندوستان کو آزاد اور بلند دیکھنے کا دل سے متمنی ہے۔ اس سرزمین پر آئینِ جدید کے نفاذ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور اسے آزادی کامل کی راہ کا بھاری پتھر قرار دیتا ہے:۔

یہ مہر ہے بے مہریٔ صیاد کا پردہ
آئی نہ مرے کام مری تازہ صفیری!

رکھنے لگا مرجھائے ہوئے پھول قفس میں
شاید کہ اسیروں کو گوارا ہو اسیری (ضربِ کلیم)

باوجود اس حبِ وطن کے وہ وطنیت کی "محدودیت" کا سخت ترین دشمن اور بین الاقوامیت کی وسعتوں کا دل سے حامی۔ مگر اس بین الاقوامیت و عالمیت کی بنیاد ایمان اور نیکی پر رکھنا چاہتا ہے۔ کیونکہ بغیر اس کے بین الاقوامیت و قومیت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ چنانچہ جب یورپ نے جنگ عظیم کے بعد ادارۂ بین الاقوامیت کی طرح ڈالی تو اقبال نے اس جمعیت کو "کفن چوروں" کی انجمن سے موسوم کیا تھا۔ جو اس پر حرف بحرف صادق آئی۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن
دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند! (پیامِ مشرق)

اس کی دوربیں نظروں نے دیکھ لیا تھا کہ مغرب کے یہ خداوندانِ سیاست حقیقی اتحاد کی غرض سے نہیں بلکہ ہوس پرستی اور جوع الارضی کو لیکر اکٹھے ہو رہے ہیں۔ اور امن عامہ و تخفیفِ اسلحہ پر گفتگو کرنے والوں میں سے ہر ایک کے کاندھوں پر آتش بار اسلحہ غلام سازی کی مشینیں لدی ہوئی ہیں ـــــ وہ ایک ہاتھ سے امن عامہ کا نقشہ مرتب کر رہے ہیں اور دوسرے ہاتھ سے مشین گنوں کو نشانہ پر ٹھیک جمانے کے لئے مصروف ہیں ـــــ

وہ دنیا سے جاتے جاتے اس "داشتۂ فرنگ" کے متعلق ایک پیش گوئی بھی کرتا گیا ہے جو پہلے قیاس کی طرح اٹل ہے:۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن　　　پیرانِ کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ
ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے! (ضرب کلیم)

نظموں کے علاوہ اقبال نے اپنی دیگر تحریروں تقریروں بھی ہر ممکن طریقے سے وطنیت کے خلاف آواز بلند کی ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ——— اقوام وملل کی تنظیم، بین الاقوامیت کی تشکیل اور اخوتِ انسانی کی ترتیب کے لئے سب سے پہلے اس امر کی ضرورت ہے کہ وطنی تفریق اور نسلی امتیاز کو بالکل ختم کر دیا جائے۔ اور ملکوں کی جغرافیائی حد بندیاں ایک سرے سے سب توڑ دی جائیں۔ وطنی اجتماعیت ایک تنگ دائرہ ہے، جس میں انسانی اخوت و مساوات اطمینان کا سانس نہیں لے سکتی۔ قومیت کے جڑ پکڑ لینے اور وطنیت کے جذبہ کے پابند ہو جانے سے دوسروں کے خلاف نفرت، تعصب، تنگ نظری و احساسِ برتری، خود پرستی و ہوناکی کے جراثیم بکثرت پھیل جاتے ہیں۔ جو انسانیت کے جسم کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیتے ہیں ——— وہ کہتا ہے انسانی قوتِ عمل کا مظہر اتم دائرہ قومیت نہیں بلکہ حلقۂ انسانیت و رشتۂ اخوت ہے۔

آج یورپ کی جدید قومیتیں جو سب کی سب انسانی آزادی و حقوق کی حفاظت کے نام پر گلے پھاڑ پھاڑ کر چیخا کرتی ہیں، مگر وہ خود انسانیت کے تمام اصول فراموش کر کے صرف اس لئے غوغا مچاتی رہتی ہیں کہ ان کے گھناؤنے خد وخال دنیا کو نظر نہ آنے پائیں۔ اور وہ طاقت کے محسوس وغیر محسوس مرکزوں کو اپنے قبضۂ اختیار میں قائم رکھ سکیں۔ اور آدمیت کے تمامی اصول وحقوق کی حقدار صرف اپنے ہی کو باور کرا سکیں۔ اور باقی سب کو

اپنے چشم و ابرو کی گردش کو سمجھنے کے لئے جگہ جگہ متعین کر دیں۔ اس طرح کیا وہ
اپنے جغرافیائی حدود وطن سے باہر کچھ کم ظلم و جبر کے شعلے بھڑکا رہی ہیں؟ کیا
اس کے ثبوت کے لیے ابھی دلائل و شواہد کے طومار کی ضرورت ہے ـــــــ
تو آؤ اور سب سے بین اور تاریخی ثبوت پر ایک نظر ڈال لو کہ اس پر کم و بیش
دو نسلیں گواہ ہیں یعنی گزشتہ جنگ عظیم جو اسی وطنیت کا نتیجہ تھی، اس کا
بہایا ہوا خون ابھی زمین سے پوری طرح خشک بھی نہ ہوا تھا کہ پھر قومیتوں کی
ایک جنونانہ دوڑ ہوئی اور ایک دوسری عالمگیر جنگ نے پہلے سے کہیں زیادہ
دنیا کو ہولناک محاربۂ عظیمہ میں مبتلا کر کے رکھ دیا ـــــــ اور اب بھی
کوئی ضمانت نہیں ہے کہ قومیت و وطنیت کا یہ خون آشام عفریت تیسری
عالمگیر جنگ کو بھی کھینچ نہ بلائے گا! ـــــــ
چنانچہ اقبال کی مشہور پیش گوئی ـــــــ "تمہاری تہذیب
اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی" کے پورا ہونے کا وقت آ گیا
اور اب دنیا دیکھ رہی ہے کہ یورپ کے مفکرین ان تباہ کاریوں کو محسوس
کر رہے ہیں اور جلد سے جلد وطنیت کی لعنت سے گلوخلاصی کی تدابیر
سوچ رہے ہیں۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے ہیں کہ قومیت و وطنیت کی محدود
سرزمین کے بجائے کوئی وسیع و عریض سرزمین تلاش کی جائے جس میں
ساری دنیا اطمینان و امن سے سانس لے سکے ـــــــ اور اس
سرزمین کا پتہ اقبال نے بتا دیا ہے جو بلاشک "انسانیت" ہے ـــــــ!
وہ کہتا ہے آؤ! میں تم کو بتاؤں کہ یہ فضا کہاں مل سکتی ہے؟ ـــــــ
اسلام نے دنیا کے سامنے وطنیت کا جو تصور پیش کیا ہے، صرف وہی تصور
قرین فطرت و عین حکمت ہے اور انسانیت کے لئے قابل قبول بھی:۔

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت کی گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
کردارِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے!

(بانگِ درا)

اِسلام نے جس قومی تعصب کو جاہلیت کے نام سے موسوم کیا تھا، آج وہی جاہلیت و بربریت، بلکہ اس سے کہیں زیادہ خون آشامی و ہلاکت آفرینی یورپ کی قومیت جدید کے لباس میں نظر آ رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ قومیت اِنسانی آزادی و تحفظ حقوق کے نام پر وجود میں آئی تھی لیکن آج اس سے زیادہ غلام گردی و پامالیٔ حقوق کو دیدہ دلیری سے جائز رکھنے والی قومیت دنیا کے پردہ پر کہیں نہیں مل سکتی :-

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی! (بالِ جبریل)

قرآنِ عظیم نے قومیت و وطنیت کی مختلف گروہ بندیوں کو تفرقہ اندازی و تفریقِ اِنسانیت کہا ہے۔ اور اس کے تمام تنگ دائروں کی ہمت افزائی سے صاف اِنکار کر دیا ہے۔

وما کان الناس الا امۃ واحدۃ
فاختلفوا (یونس)

"اِنسانوں کی جماعت تو صرف ایک ہی جماعت ہے اور وہ اِنسانیت ہے۔ مگر لوگ بے شمار اور مختلف دائروں میں بٹ گئے ہیں، اور اس طرح انھوں نے آپس میں

پھوٹ ڈال لی ہے۔"

دراصل اسلام کا عقیدۂ توحید ہی وحدتِ انسانیت کی تشکیل کرتا ہے۔ جس سے اجتماعیت کے تمام تنگ دائرے سمٹ کر اس ایک بڑے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ قرآن نے دعوتِ انسانیت دی تھی۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس دعوت پر دنیا میں انسانیت کے بجائے، اسلامیت کا دائرہ بن گیا لیکن یہ تو خود دنیا کے ظرف کی تنگی تھی، کہ وہ اس کو یکایک قبول نہ کرسکی ورنہ وہ تو فرماتے ہیں :—

کوئی قابل ہو تو ہم شان کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والوں کو دنیا بھی نئی دیتے ہیں (بانگِ درا)

تاہم اسلامیت کا حلقہ بھی اتنا وسیع حلقہ ہے کہ اس کے اندر دنیا کے تمام گزشتہ و موجودہ علقے ہر وقت سما سکتے ہیں۔ انسانیت کی سرحد اسلامیت سے بالکل جدا نہیں، بلکہ باہمدگر متصل ہے۔ اگر دنیا چاہے تو اس حلقہ میں آکر ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے انسانیت کی سرحد میں داخل ہوسکتی ہے۔ لیکن ابھی اسے قومیت کی دلدل سے نکلنے میں دیر لگے گی ——— لیکن یہ جان لینا چاہیئے کہ قومیت و انسانیت کے مابین وسطی زینہ اسلامیت کا ہی ہے۔ اس راہ سے رفتہ رفتہ بڑھنے کا بہتر امکان ہے جس کو نظرانداز کرنا نہایت تباہ کن تعصب کا مظاہرہ کرنا ہے۔ وہ لوگ احمقوں کی جنت کے رہنے والے ہیں جو قومیت کے دروازہ پر کھڑے ہو کر اسلامیت کی طرف سے پیٹھ کرکے انسانیت کی فضا ڈھونڈ رہے ہیں۔

ملتِ اسلامیہ کی تکمیل ہی ملتِ انسانیہ کی تشکیل ہے۔ کیونکہ اس کے گرد رنگ و نسل اور جغرافیائی حدود کا حصار نہیں جیسا کہ موجودہ قومیتوں کے

گرداگرد قائم ہے۔ بلکہ اس کو آب وگل کی فصیل کے بجائے ایمان و توحید کا مستحکم احاطہ دامن میں لئے ہوئے دنیا کے مختلف گروہ خواہ وہ کسی نسل سے ہوں، کسی خطۂ ارض میں آباد ہوں اور کسی معاشرت کے حامل ہوں اور انکی زبانیں بھی کتنی مختلف و متضاد کیوں نہوں مگر ایمان و توحید کے احاطہ میں داخل ہونا سب کے لئے آسان ہے، اسلام کے حدود میں داخل ہوتے ہی سب کا منصب ایک ہو جاتا ہے، رنگ و نسل، تمدن و معاشرت، اور اختلافِ زبان کی کوئی مغائرت ان سب کے دلوں کو ایک بنانے سے نہیں روک سکتی۔ وہ سب ایک ہی نصب العین کے حامی، ایک ہی انداز کے مفکر اور ایک ہی نظر کے ناظر ہو جاتے ہیں:۔

با وطن وابستۂ تقدیرِ اُمم
بر نسب بنیادِ تعمیرِ اُمم

اصلِ ملت در وطن دیدن کہ چہ؟
باد و آب و گل پرستیدن کہ چہ؟

ملت ما را اساسِ دیگر است
ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است

حاضریم و دل بغائب بستہ ایم
پس ز بندِ این و آں وارستہ ایم

تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما
یک نما، یک بیں، یک اندیشیم ما

مدعائے ما مآلِ ما یکیست!!
طرز و انداز و خیالِ ما یکیست

ما ز نعمت ہائے او اخوان شدیم
یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم (رموز)

زمانہ کے انقلابات اور حوادث کے زیر اثر ملکوں کے جغرافیائی حدود بدلتے رہتے ہیں۔ متمدن سے متمدن ممالک کا شیرازہ وقت کی کروٹوں سے بکھر جاتا ہے۔ اور صدیوں کے بعد صرف اثریات کی دلچسپی اور تحقیق کے لئے ان کے کھنڈر و آثار ہی باقی رہ جاتے ہیں اس لئے جس قوم کی بنیاد کسی مخصوص خطۂ زمین میں گڑی ہوئی ہو اس کی قومیت پائیدار نہیں رہ سکتی۔ وہ بہت جلد تغیرِ وقت کے ساتھ مٹ جانے والی ہے۔ لیکن یہ خصوصیت صرف ملت اسلامیہ ہی کا حصہ ہے کہ وہ زمان و مکان کی قیدوں سے بالکلیہ آزاد ہے۔ نہ کوئی انقلاب اسے میٹ سکتا ہے، نہ کوئی تباہ کاری اس کی سرحدوں میں داخل ہو سکتی ہے۔ وہ دنیا سے وابستہ نہیں بلکہ دنیا اس سے وابستہ رہنے پر مجبور ہے۔ وہ دریاؤں اور پہاڑوں کو نہیں پوجتی بلکہ دریاؤں اور پہاڑوں کے پیدا کرنے والے کے آگے سرِ عبودیت جھکاتی ہے۔ جو آسمان و زمین کی ساری عظمتوں کو اسکے آگے منقاد و مطیع اور زیر حکم کر دیتا ہے۔ اس کا وطن ہند و روم اور شام و یونان نہیں جو فنا ہوتے رہتے ہیں اور من جملہ اپنے دیگر ساتھیوں کے فنا ہو جانے والے ہیں، بلکہ اس کا ملجا و ماوےٰ اور مسکن و وطن اسلام اور صرف اسلام ہے، جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہیگا:۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے، تو نہیں جہاں کے لئے

مقامِ پرورشِ آہ و نالہ ہے یہ چمن
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے
رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک؟
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بیکراں کے لئے
نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے
نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے
ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے
بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لئے! (بالِ جبریل)

جوہرِ ما با مقامے بستہ نیست
بادۂ تندش بجامے بستہ نیست
ہندی و چینی سفالِ جامِ ماست
رومی و شامی گلِ اندامِ ماست
قلبِ ما از ہند و روم و شام نیست
مرز و بومِ او بجز اسلام نیست
زانکہ ما از سینہ جاں گم کردہ ایم
خویش را با خاکداں گم کردہ ایم
مسلم استی دل با قلیمے مبند!
گم مشو اندر جہانِ چون و چند!

(رموز)

ملت جاودانی و اخوتِ عالمگیری کا صحیح صحیح تصور صرف اسلامیت ہی میں ملتا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیاد ہی وحدانیت اور ایک کلمۂ حق پر استوار کی گئی ہے۔ زمین کا چپہ چپہ اس کی مسجد، دنیا کا ہر ہر خطہ اس کا وطن اور دنیا کے تمام باشندے اس کی برادری اور اہلِ وطن ہیں۔ اگر کوئی دوسروں سے محض نسلی و جغرافیائی اختلافات کی بنا پر بُعد رکھتا ہے تو مسلمان انھیں اختلافات کی موجودگی میں بھی اہلِ عالم کو عالمگیر برادری سے خارج کرنے کے لیے تیار نہیں:۔

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا! (بانگِ درا)

مسلمان تمام دنیا کی اصلاح و ترقی کے لئے پیدا ہوا ہے، کیونکہ مسلمانوں کے رسولِ پاک صرف رحمتِ چین و عرب نہیں، رحمت اللعٰلمین تھے بلکہ سرتاپا رحمت ہی رحمت اور تمام عالموں کے لئے سرچشمۂ حکمت و موعظت تھے۔ جو نبی آخرالزماں رحمتِ دوجہاں کے صحیح معنیٰ میں پیرو ہوں، ان سے ہر محدودیت کوسوں دور، اور ہر تصور وسعت و نظریۂ عالمگیر اخوت ان کا ایمان و فکرِ عمل ہے۔ رسولِ اکرمؐ ہی نے سب سے پہلے نوعِ انسانی کی صلاح و فلاح کا نصب العین دنیا کے سامنے رکھا۔ اور یہ نصب العین جس قوم کے بھی پیشِ نظر ہوگا، وہ خواہ کتنی ہی کمزور و کم تعداد کیوں نہ ہو، دنیا کی تمام طاقتوں اور عددی بیشیوں پر طاری ہو کر رہے گی۔

اقبال، داعئ اسلامؐ کی ہجرت کا حوالہ دیتے ہوئے وطنیت کے تصور کو ان الفاظ میں واضح کرتا ہے:۔

عقدۂ قومیتِ مسلم کشود		از وطن آقائے ما ہجرت نمود

حکمتش یک ملت گیتی نورد
بر اساس کلمہ تعمیر کرد!
تا ز بخششہائے آن سلطان دین
مسجد ما شد ہمہ روئے زمین
قصہ گویان حق زما پوشیدہ اند
معنئ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئین حیات مسلم است
این ز اسباب ثبات مسلم است
معنئ او از تنک آبی رم است
ترک شبنم بہر تسخیر یم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو !!
یعنی از قید وطن آزاد شو !! (رموز)

وطنیت انسانیت کی نفی کرتی اور عصبیت کی تلقین کرتی ہے۔ نوع انسانی کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرکے محدود نظر اور تنگ دامن بناتی ہے اور دنیا میں کشت وخون کے بازار کی اساس رکھتی ہے۔ دنیا نے جب سے جدید قومیت کا لبادہ اوڑھا ہے، زمین شر وفساد سے اٹ گئی ہے اور اس فتنۂ جدت نے اپنی جدت طرازیوں کے زعم میں دنیا کے گزشتہ تمام تجربات کا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔ اس کی بدولت دنیا سے آدمیت یک قلم رخصت ہو گئی ہے۔ لیکن قومیتیں وجود میں آ گئی ہیں —— قومیتیں —— لاتعداد قومیتیں —— ہر ایک، ہر دوسری سے بڑھ کر —— ہر دوسری ہر تیسری پہ فائق —— غرض

افضلیت و برتری میں کوئی کسی سے کم دعویدار نہیں، پھر بھی دنیا کی ہر بدتری ان کا شیوہ اور ان سے وابستہ ہے:۔

جنھیں گمان ہے اپنی فلک نشینی کا
انھیں زمیں کی پستی بھی سازگار نہیں!

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو
آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور

زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور (ضربِ کلیم)

اور آئے دن یہ قومیتیں ایک دوسرے کو پھاڑ کھا جانے کے لئے اپنے اپنے ناخن تیز کرتی رہتی ہیں:۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند
بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند

تا وطن را شمعِ محفل ساختند
نوعِ انساں را قبائل ساختند

ایں شجر جنت ز عالم بردہ است
تلخیٔ پیکارِ آبا مردہ است

مردمی اندر جہاں افسانہ شد
آدمی از آدمی بیگانہ شد!

روح از تن رفت و ہفت اندام ماند
آدمیت گم شد و اقوام ماند! (رموز)

اقبال مسلمانوں کو آگاہ کرتا ہے کہ تم کہیں اس ریتلے ڈھیر پہ

قلعہ سا بنانا، تمہاری ملت کی تعمیر تو اس سخت اور مضبوط چٹان پر ہوئی ہے، جسے اگر تم خود نہ چھوڑ دو تو کوئی طاقت تمہاری بنیادوں کو نہیں ہلا سکتی۔ تمہارے رشتہ اجتماعی کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ دنیا کی ساری وسعتیں اس پر تنگ ہیں۔ اور ہر وقت اس میں سما جا سکتے ہیں۔ تم دنیا میں پیکر اخوت ناشر رحمت بن کر آئے ہو ——— تشتت وافتراق اور ہلاکت وعذاب کے علمبرداروں میں تمہارا نام نہ ہونا چاہیئے

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے
یہ ہے نہایت اندیشہ و کمال جنوں!

طلوع ہے صفتِ آفتاب اس کا غروب
یگانہ اور مثالِ زمانہ گوناگوں!

عناصر اس کے ہیں روح القدس کا حسن و جمال
عجم کا حسن طبیعت عرب کا سوز دروں

حقائقِ ابدی پر اساس ہے اس کی
یہ زندگی ہے نہیں ہے طلسمِ افلاطوں (ضربِ کلیم)

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری!

دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی!

(بانگ درا)

قوم مذہب سے ہے، مذہب جو نہیں تم بھی نہیں
جذبِ باہم جو نہیں، محفلِ انجم بھی نہیں! (بانگ درا)

ایک اور جگہ جدید قومیت کو مخاطب کرکے کہتے ہیں:۔

تری دنیا جہانِ مرغ و ماہی
مری دنیا فغانِ صبح گاہی
تری دنیا میں میں محکوم و مجبور
مری دنیا میں تیری پادشاہی! (بال جبریل)

طارق کی زبان سے کس قدر دلنشیں انداز میں وطنیت کی تنسیخ کی ہے کہ روحِ بین الاقوامیت وجد میں آتی معلوم ہوتی ہے:۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا است!
دوریم از سوادِ وطن باز چون رسیم؟
ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت
ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست! (پیامِ مشرق)

قومیّت کے غرور نے انسان کو کس درجہ پر پہنچا دیا ہے اقبال ہی کی زبان سے سنیئے:۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است
من ندیدم کہ سگے پیش سگے سر خم کرد

وہ جب دیکھتا ہے کہ یورپ کا یہ مذموم نظریہ دنیائے اسلام میں غلبہ حاصل کر رہا ہے اور دنیا کی واحد انسانیت پرور ملت، عالمگیر اخوت کے نصب العین سے بیگانہ ہو کر خود چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ کر اپنی طاقت کو زائل کر رہی ہے اور توحید کے بجائے آب و گل کے مختلف بتوں کو پوج رہی ہے، تو بحیثیت مسلمان ہونے کے اس کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ اس کو تباہی کے غار میں گرتے ہوئے دیکھ کر اس کا سینہ شق ہو جاتا ہے۔

دل سوز سے خالی ہے، نگہ پاک نہیں ہے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ہے

ہے ذوقِ تجلی بھی اس خاک میں پنہاں
غافل! تو نرا صاحبِ ادراک نہیں ہے

وہ آنکھ کہ ہے سرمۂ افرنگ سے روشن
پرکار و سخن ساز ہے! نمناک نہیں ہے

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے! (بالِ جبریل)

میرِ سپاہ ناسزا، لشکریاں شکستہ صف
آہ! وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف!

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج دیکھ چکا صدف صدف

عشقِ بتاں سے ہاتھ اٹھا اپنی خودی میں ڈوب جا
نقش و نگارِ دیر میں خونِ جگر نہ کر تلف!

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقام مرگ و عشق
عشق ہے مرگ با شرف، مرگ حیات بے شرف!
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ "مدینہ" و نجف! (بالِ جبریل)

پھر ایک اور آہِ جگر دوز اقبال کے دکھے ہوئے دل سے خون میں ڈوبی ہوئی نکلتی ہے:-

ابلہی در دشتِ خویش از راہ رفت
از دم او سوزِ اِلّا اللہ رفت!

مصریاں افتادہ در گردابِ نیل
سست رگ تورانیانِ ژندہ پیل

آلِ عثماں در شکنجِ روزگار!
مشرق و مغرب زخونش لالہ زار

عشق را آئینِ سلمانی نماند
خاکِ ایراں ماند، ایرانی نماند

سوز و سازِ زندگی رفت از گلش
آں کہن آتش فسرد اندر دلش!

مسلمِ ہندی شکم را بندۂ
خود فروشے دل ز دیں برکندۂ

در مسلماں شانِ محبوبی نماند
خالدؓ و فاروقؓ و ایوبیؒ نماند! (پیامِ مشرق)

اِقبال بین الاقوامیت کا حامی ہے۔ اِس لئے بین اِسلامزم کا علمبردار ہے کیونکہ اِتحاد بین المسلمین ہی اِتحاد بین الاقوام کا سنگ بنیاد ہو سکتا ہے۔ ذیل کے اشعار میں حُدی سوڈانی کی زبان سے "روح عرب" کو بیداری کا پیغام دیتا ہے۔ اس کا ایک ایک لفظ کتنا پرشوق و پرسوز ہے کچھ اسے پرشوق و پرسوز دل ہی خوب سمجھ سکتے ہیں۔ ہر ہر مصرعہ خونِ جگر سے لکھا ہوا، اور حرف حرف اور نقطہ نقطہ میں سینکڑوں پرشوق و بیتاب تمنائیں پیچ و تاب کھاتی معلوم ہوتی ہیں۔ خصوصاً پانچواں شعر اِس قیامت کا ہے کہ وجد و کیف کی روح جھوم جاتی ہے اور روئیں روئیں سے بالیدگی پھوٹ نکلتی ہے۔

گفت: اے "روح عرب" بیدار شو!
چوں نیاگاں خالقِ اعصار شو!
اے فواد، اے فیصل، اے ابن سعود!
تا کجا بر خویش پیچیدن چو دود؟

خاکِ بطحیٰ! خالد دیگر بزائے
نغمۂ توحید را دیگر سرائے!
اے نخیلِ دشت تو بالندہ تر!
برنخیزد از تو فاروقے دگر؟ (جاوید نامہ)

اِقبال کے تمام موضوعاتِ سخن میں "خودی" کے علاوہ بین الاقوامیت کا موضوع سب سے زیادہ اہم بلکہ اس کا واحد نصب العین ہے۔ اور اِس وقت بھی اجتماعیت کے نقطۂ نظر سے اِسلامیانِ ہند کے لئے وقت کا اِتنا نازک ترین

...اور اہم مسئلہ ہے کہ اس پر ان کی آیندہ اجتماعی و سیاسی زندگی کا پورا پورا انحصار ہے۔ اس لئے یہ بحث بالکل ادھوری رہ جائے گی اگر اس کو سیاسیات کے موجودہ رجحانات کی روشنی میں نہ دیکھا جائے۔ اقبال کے اس نظریہ کی توضیح و تشریح کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تصویر کا دوسرا رخ سامنے لانیکی جستہ جستہ اپنا نقطۂ نظر بھی واضح کر دوں۔ اگرچہ مجھے اقبال کے متعلق یہ کہتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ اقبال کے اس پیغام میں آزاد ممالک اسلامیہ کے لئے تو یقیناً استفادہ کے بے شمار پہلو نظر آتے ہیں، لیکن ہندوستان کے مسلمانوں کی ہدایت و رہبری کے لئے اس میں کوئی روشنی و جاذبیت نہیں۔

اقبال نے ہندوستان کی موجودہ فضا میں اتحاد بین الملل اور اتحاد بین المسلمین کا نغمہ اس زور سے چھیڑا کہ اسلامیان ہند کے جذبات قومیت اس کی بالکل تاب نہ لاسکے ——— سہی کہ دائرۂ قومیت میں کچھ عرصہ کے قیام کے بعد تنگ نظری تعصب و نسلی غرور اور قومی برتری و وطنی تکبر کے نقوش اس شدت سے ابھر آتے ہیں جو اسی دائرہ ہی کو محیط ہو جاتے ہیں لیکن کیا اس سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ قومیت غلامیت کی ضد اور اس کی کامیاب حریف ہے؟ غلامیت جو دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور اسلام کے بالکل منافی ہے، اس کے طوق و بند اسی سے کٹ کر گرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی غلامیت کی بیخ کنی کے لئے تو سب سے پہلے وطنیت و قومیت کی ضرورت ہے کہ اس کی غلامی عالم اسلامی کے لئے مصیبت و عذاب بن کر رہ گئی ہے ——— بغیر ہندوستان کے آزاد ہوئے، پین اسلامزم کا تخیل عملی دنیا میں تخیل سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور اس تخیل کا عملی جامہ پہننا ازبس دشوار ہے۔

قومیت کی جو کچھ برائیاں گنائی جائیں ــــــ سب تسلیم! ــــــ
مگر اس میں برائیوں کے ہوتے ہوئے بھی، مظلومیت کی بیچارگی، غلامی کی ذلت
اور بندگی کی جبین سائی بہرحال نہیں ہے ــــــ کسی غلام ملک نے
اپنی قومیت کی تعمیر کئے بغیر کب غلامی سے نجات حاصل کی ہے؟ ــــــ
پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اس استعمار شکن ہتھیار
کو نیام میں رہنے دیا جائے۔ اور اس حریف استبداد کو حرکت میں نہ لایا جائے
اقبال غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لئے "ذوق یقین" ضروری شرط قرار دیتا ہے
لیکن یہ "ذوق یقین" بجز قومیت کے اور کہاں نشو ونما پا سکتا ہے؟ یہ بھی تو اسی
وقت بیدار ہوتا ہے کہ ملک کے باشندے آزادی کے نصب العین پر نظر جما کر
ایک "قوم" بن جائیں وطنیت آب وگل کی پرستش کا دوسرا نام سہی، لیکن عالم
محسوسات میں وطن کے علاوہ اور کونسی چیز ایسی ہوسکتی ہے، جو اس کا نعم البدل
ہو، اور ابنائے وطن کے نہالِ حریت کی آبیاری کرے؟ ــــــ
اقبال پر ہندوستان ہمیشہ فخر کرے گا، خود اس کو بھی خاک ہند سے
شدید محبت تھی اور اس کی غلامی پر اس کا دل بے طرح کڑھتا تھا۔ وہ عقیدتاً غلامی
کو بدترین لعنت اور آزادی کو بہترین نعمت سمجھتا تھا۔ اسی لئے مجھے اس پیغمبر
حیات سے شکوہ ہے کہ اس نے ہندوستان کو غلامی سے نجات دلانے کے اسباب
اور حصولِ آزادی کی کوئی موثر تدبیر نہیں بتلائی۔ جبکہ وہ ہندوستان نژاد تھا تو
سب سے پہلے اس پر ہندوستان کے حقوق لازم آتے تھے۔ بہتر ہوتا کہ وطنی
سیاست میں وہ کوئی عملی حصہ نہ لیتا۔ اس کا نظریۂ پاکستان اور ہندوستان
بھی اسی قسم کی سیاسی لغزش تھی، جس کو ایک طبقہ اب تک صحیح سمجھ رہا ہے۔
اس کے پیغام بین الاقوامیت میں ہم مستقبل کے آزاد ہندوستان کا نصب العین

اور لائحۂ عمل تو تیار کر سکتے ہیں، مگر حال میں ہمیں اس سے بالکل قطع نظر کر لینی پڑتی ہے۔ اگر وہ قومیت کا شدید دشمن اور اصنام اوطان کا ابراہیم تھا، تو اس کو اپنے وطن کی آزادی کے لئے پہلے کوئی راہ عمل متعین کر دینی چاہیئے تھی: جو قومیت کا صحیح نعم البدل اور اس سے زیادہ موثر طاقت ہوتی۔ ایک طرف تو وہ اشخاص کی فردیت پر زور دیتا ہے اس لئے کہ خودی مستحکم ہو کر بیخودی میں ضم ہو جائے۔ یعنی انفرادیت اپنی جگہ مکمل ہو کر اجتماعیت کی تشکیل کرے۔ لیکن دوسری طرف قومیت کا مخالف اور بین الاقوامیت کا حامی بن کر اس عمدہ اصول کی نقیض و تضاد پیش کرتا ہے۔ حالانکہ خودی و بیخودی کا یہی اصول قومیت و بین الاقوامیت میں بھی کارفرما ہونا چاہیئے تھا۔ ــــــــــ

میں فرض کرنا نہیں چاہتا کہ اس اغماض یا فروگزاشت کے واقعی اسباب کیا تھے؟ ــــــــــ کیونکہ یہ عنوان کافی طویل ہو چکا ہے، اس لئے میں اسی بحث میں پڑ کر اس کو اور طول دینا نہیں چاہتا بلکہ مختصراً اب صرف اس قدر اور بتاؤنگا کہ اقبال کیا پیش کر رہا تھا۔ اور ہندوستان کے "مرد بیمار" کو کس دوا کی ضرورت تھی! ــــــــــ اور اس باب میں اسلام و تاریخ کا کیا فیصلہ ہے؟ ــــــــــ ہو سکتا ہے کہ میرے نظریات ایک سرے سے سب غلط ہوں۔ لیکن مناسب رہبری پر میں ہر وقت اپنی اصلاح کرنے پر آمادہ ہوں ــــــــــ اسی لئے میری تحریر میں طنز کا ہلکا سا شائبہ بھی نہیں ہے اور میں درحقیقت نہایت درجہ دکھ محسوس کرتے ہوئے یہ اخلاقی نوٹ لکھ رہا ہوں ــــــــــ میں ہرگز اس بحث میں نہ پڑتا اگر یہ اقبال کے مہات سخن میں سے نہ ہوتی۔ کیونکہ اقبال کا کلام محض "شاعری" اور اوقات فرصت کا مشغلہ نہ تھا۔ بلکہ وہ اس راہ سے عملیت کو جھنجوڑتا اور دل و دماغ پر گہرا نقش

ڈالتا ہے۔ اِس لئے اس کے ہر موضوع سخن کو کافی وقتِ نظر اور تفصیل کے ساتھ دیکھنے کی ضرورت ہے۔

ہندوستان کے اندر ہماری دو حیثیتیں ہیں' ——— ایک مسلمان ——— دوسرے ہندوستانی! ——— یہاں اِس سے بحث نہیں کہ پہلے ہمیں کیا ہونا چاہیئے؟ ——— میں اس سوال کو انڈے اور مرغی کی تخلیق میں تقدیم و تاخیر جیسا لاحاصل مباحثہ سمجھتا ہوں۔ اور ایک علیت سوز مغالطہ! ——— البتہ اِس مسئلہ کو یوں پوری اہمیت دیتا ہوں کہ مسلمانوں کو ان میں سے کسی ایک پہلو کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے پہلو کو نظرانداز نہ کر دینا چاہیئے ——— ان کو ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی ہونے کے ساتھ مسلمان ہونا چاہیئے' اور مسلمان ہونے کے ساتھ ہندوستانی! ——— اگر ان میں سے کسی ایک پہلو سے اعراض کر لیا جائے تو بے انتہا خسارہ ہی خسارہ ہے ———

مسلمان یہاں محض اِس لئے ٹوٹے میں رہے ہیں کہ اُنھوں نے "ہندی مسلمان" کے نام سے موسوم ہونے کو نہ صرف غیر اہم جانا' بلکہ ان کے وابستہ نے اِس نسبت میں اپنے لئے شرم و ذلت دیکھی۔ اور ہندوستان کے اندر پشتیں گزار دینے پر بھی' وہ بخارا و سمرقند اور مصر و حجاز سے اپنے رشتے ملاتے رہے۔ لیکن اب ہندوستان کی سیاست ایسے نقطہ پر آپہنچی ہے ہم اِس باب میں ان کو جلد سے جلد کوئی فیصلہ کر لینا چاہیئے۔ اور ان کے لئے ہندوؤں سے وطنی و قومی بنیادوں پر بھی معاملت کر کے ہندوستان کی متحدہ قومیت کا سنگ بنیاد رکھنا ناگزیر ہے ———

اقبال نے جس اسلامی وطنیت پر زور دیا ہے' اس کی حیثیت بیشک

بہت اہم اور نہایت بلند ہے، لیکن وہ اسلام کے اسی دور کے تصوّرِ وطنیت کی آئینہ دار ہے، جو اسلامی حریت کا دور تھا، یعنی اسلامیت کا وہ تخیّل جس میں عرب مسلمان، غلام نہیں آزاد بلکہ علمبردارِ آزادی تھے، اگر عرب غلام ہوتے تو حضور نبی کریمؐ (روحی فداہ) کا پہلا فرض یہی ہوتا کہ وہ اپنی قوم کو حضرت موسیٰؑ کی طرح پہلے غلامی کی دلدل سے نکالتے اور اس کے بعد بین الاقوامی بنیادوں پر ان کی مذہبی تنظیم فرماتے۔

چنانچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے اس دور میں وقت کی سب سے پہلی پکار یہی ہے کہ ان کی بین الاقوامی بنیادوں پر مذہبی تنظیم اور کامل دینی اصلاح و تبلیغ کے بجائے، ان کو اسلام کے صرف بنیادی ارکان پر مجتمع کر کے جنگِ آزادی کے میدان قومیت میں کھڑا کر دیا جائے ——— اگر آئینہ کا فریم شکستہ اور صیقل اندھا ہو تو پہلے صیقل کی جاتی ہے، فریم کی طرف کوئی بھی دھیان نہیں کرتا۔

برخلاف اس کے اقبال غلام ہندوستان کے سامنے ایک آزاد قوم کی وہ جدوجہد رکھتا ہے، جو اگرچہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے کتنی ہی مفید و بہتر کیوں نہ ہو لیکن بہرحال وہ بعد کی چیز ہے ——— آئینہ کا فریم ہے، صیقل نہیں! اس لئے غلاموں کے لئے اس میں کوئی استفادہ بہتر ہی نہیں ہے۔ کیونکہ موجودہ صورت میں اس کو انگیز کرنے پر ان کے کمزور قدم بار بار پھسلنے لگیں گے۔ اور ابھی وہ طاقت کہاں آئی ہے کہ اس بارِ عظیم کے متحمل ہو سکیں ——— ایک کمزور انسان، جوان آدمی کی عقلیت کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ تاوقتیکہ وہ خود جوان نہ ہو ——— ظرف غلامیت بہت ہی تنگ و تاریک ہوتا ہے۔ اگر اس کو توڑ کر دوسرا نیا ظرف بنائے بغیر

اس میں کوئی لطیف شئے ڈالی جائے اور کثیر مقدار میں بھی، تو وہ فوراً چھلک جائے گا اور جتنا حصہ اس میں رہے گا بھی، وہ بیحد کثیف نظر آئے گا۔ اقبال کا یہ تصور عالمیت اُن ممالک اسلامیہ کے لئے بیشک سود مند ہے، جو آزاد وخود مختار ہیں ——— اگر ہندوستان میں بھی آزاد وخود مختار اسلامی حکومت ہوتی تو یقیناً ان کے لئے بھی یہ نسخہ، نسخۂ کیمیا ثابت ہوتا۔ موجودہ صورت میں ہم کو اس شاہراہ فطرۃ اللہ تک پہنچنے کے لئے کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈنا پڑیگا۔ اور اس جستجو میں بھی ہمارے لئے کامل راہبر قرآنِ عظیم اسوۂ رسول ؐ پاک اور اسلامی تاریخ ہے ———

اگرچہ اقبال کا یہ مقصد نہ ہو، لیکن اس کے اتحاد بین اسلام کا پرشور نعرہ اور والہانہ غلو اس نیتجہ پر پہنچاتا اور عوام کی ذہنیتوں کو غیر شعوری طور پر نہایت موثر انداز میں اس طرف مائل کرتا ہے، اسلام کے اصولوں میں غیر مسلموں سے رابطہ و اتحاد کے لئے کوئی گنجائش اور کوئی لچک نہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کی پاکستان کی تجویز اسی خیال کے ماتحت تھی۔ آخر اس تجویز سے اور کیا نیتجہ نکلتا ہے؟ ——— کیا واقعی یہ کسی حیثیت سے بھی قابل قبول ہے؟ ——— اور کیا اس سے اس کے نظریۂ بین الاقوامیت پر براہ راست ضرب نہیں پڑتی؟ ——— اگر بین اسلام ازم کا مقصد غیر مسلموں سے نفرت و دشمنی ہے تو یہ مقصد اسلامی تعلیمات کے سراسر منافی ہے۔ جہاں تک اسلام کے بنیادی عقائد واساسی اصولوں اور بنیادی ارکان کو کوئی ٹھیس نہ لگتی ہو، کسی سے نفرت و دشمنی جائز نہیں۔ اسلام کی فطرت میں بہت لچک ہے، وہ تمام دنیا کے لئے ابر رحمت بن کر آیا ہے۔ اس نے مجبوری و مختاری دونوں حالتوں میں جب بھی غیر مسلم جماعتوں کے ساتھ معاہدے

گئے ہیں، وہ اخوتِ انسانی و مساواتِ بنی نوع کے پورے پورے آئینہ دار ہیں خصوصاً صلح حدیبیہ وغیرہ میں تو ہمارے لئے بہت سے سبق پنہاں ہیں۔ پھر سیاست سے ہٹ کر خانگی و معاشرتی زندگی میں بھی غیر مسلموں کے ساتھ نبی کریمؐ کا برتاؤ اور صحابۂ کرامؓ کا طرزِ عمل اسی اِنسانیت پرور صلح و مساوات کی مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے۔

پین اسلام ازم کے لئے اِقبال قیام خلافت پر بھی زور دیتا ہے، بیشک مِلّتِ اِسلامیہ کی مرکزیت اور سیاسی و جماعتی مصالح کے پیشِ نظر قیام خلافت کا مسئلہ بہت ضروری اور اوّلین ہے۔ مگر موجودہ دور میں یہ کام جن دشواریوں میں گھرا ہوا ہے وہ ہر صاحب نظر کے سامنے ہے۔ اس کے لئے ابھی بہت بڑا میدان کانٹوں اور جھاڑ جھنکاڑ سے صاف کرنا ہے۔ پھر ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے بجز اس کے اور کوئی کام مقدم نہ ہوگا۔ لیکن بحالاتِ موجودہ تو احیائے خلافت پر غور کرنے کے لئے ذرا سا وقت بھی نہیں دیا جا سکتا کیونکہ ابھی تو سر پہ وہ بوجھ رکھا ہوا ہے، جس کو اِنسانی اور اِسلامی نقطۂ نظر سے دور کرنا دیگر تمام مسائل سے زیادہ اہم ہے۔ مسلمانوں کے فکر و عمل کی تمام قوتیں ابھی تو صرف اس بار سے ہلکا ہونے کے لئے وقف ہونی چاہیئے۔

قومیت کی دشمنی میں اِقبال بین الاقوامیت کا صور پھونکنے میں کچھ ایسا محو ہو گیا کہ قوموں کی اِنفرادیت کے چراغوں کے جھلملا جانے اور بجھ جانے کے اندیشہ کو بالکل خاطر میں نہ لایا۔ حالانکہ اقبال ہی اس محویت سے خالی الذہن ہونے کے بعد اچھی طرح اس حقیقت کو سمجھ سکتا تھا کہ غلاموں کی آزادی دنیا کی ترقی اور بین الاقوامیت کے لئے جہاں نہایت ضروری ہے وہاں اقوام عالم کی جداگانہ اِنفرادیت کا اِستحکام اور ان کی قومی عصبیتوں کا اِستحفاظ بھی بنیادی چیز ہے! —

مختلف اقوام کے جدا جدا قومی دائرے بالکل فطری ہیں۔ ایک مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ جس سے کسی صورت سے آنکھ نہیں چرائی جا سکتی۔ کسی قوم کی خصوصیات، وطنی نسبت، عصبیت قومی کو مٹانا فطرت کے از بس خلاف ہے۔ اور دنیا میں اب تک ایسا نہیں ہوا۔ نسلی امتیاز اور ملکوں کی جغرافیائی حد بندی، اقوام و ملل کی تنظیم اور حیات اجتماعی کی تربیت کے لئے بہت ضروری ہے۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ ایک وقتی و عارضی صورت ہے۔ اگر اس کو مستقل حیثیت سے تسلیم کر لیا جائے گا تو ایک ہولناک و ہوس پرور تفریق اور غرور انگیز تنفر کی جڑیں مضبوط ہو جانے کا قوی احتمال پیدا ہو جاتا ہے۔ وطنی اجتماعیت ایک تنگ دائرہ ضرور ہے، لیکن اس کو سرے سے مٹا دینا بھی قرین مصلحت نہیں۔ بلکہ اس کو قائم رکھنا ہی زیادہ مناسب ہے۔ ایک بڑے حلقہ کی تشکیل کے لئے اور وہ بڑا حلقہ بین الاقوامیت و انسانیت کا ہے۔ قومیتوں کی موجودہ تباہ کاریاں بالکل نفسیاتی ہیں۔ اور اس کے لئے حجت قاطع ہیں کہ ہر ملک کے باشندوں کو "قوم" بن جانا چاہیئے۔ تاکہ یہ تباہی ختم ہو۔ در اصل یہ تباہی رد عمل ہے ایک دوسری انتہا پرستی کا ——— وہ وقت بھی نزدیک ہے کہ اسلام نے اِس باب میں اب سے بہت پہلے جو فیصلہ کر دیا تھا وہ اپنی پوری صداقت کے ساتھ صادق آئے۔

اسلام نے اس قسم کے تنگ دائروں کی ہمت افزائی بیشک نہیں کی۔ لیکن قوم و وطن کے تحفظ اور اس حیثیت کے تسلیم کرنے سے انکار بھی نہیں کیا۔ بلکہ ایک عدل و اوسط پیش کر دیا ہے، جو قومی و وطنی عصبیت کا دشمن نہیں ہے بلکہ اس کے تحفظ کی حمایت کرتا ہے:۔

وجعلنا کم شعوباً و قبائل لتعارفوا

ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم (حجرات)

" ہم نے تو خود تم کو مختلف گروہوں اور قبیلوں میں
تقسیم کر دیا ہے، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو،
مگر اللہ کے نزدیک وہی باعزت ہے جو پرہیزگار ہو،
اور اس خود شناسی کو خود بینی سے بدل کر نفرت
و دشمنی کے جذبات اپنے دل میں نہ پالے "

اِس آیت شریف میں لفظ " لتعارفوا " پر جو زور دیا گیا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام قومی عصبیت باقی رکھنا چاہتا ہے تاکہ جماعتوں کا تحفظ ہو اور غالب و طاقتور جماعتیں کمزور جماعتوں کو نگل نہ سکیں ـــ اس کے بعد تقوے اور ایمان پر اس لئے زور دیا ہے کہ اس دائرہ میں وہ دوام نہ پیدا ہو جو انسانیت کی ضد اور اخوت و ملت کی مخالف ہے۔
اسلام کے اس اصول کے مطابق مختلف قومیتیں اپنی انفرادیت وعصبیت کو باقی رکھتے ہوئے تقویٰ و پرہیزگاری کے ماتحت افراط و تفریط سے بچ کر بین الاقوامیت کی رکن بن جاتی ہیں - اور رشتۂ انسانیت ان سے منقطع نہیں ہونے پاتا۔

ولو شاء ربک لجعل الناس
امۃ واحدۃ ولا یزالون
مختلفین الا من رحم ربک (یوسف)

" اگر تمہارا پروردگار چاہتا تو تمام دنیا کے لوگوں
کو اوضاع و اطوار وغیرہ کے لحاظ سے ایک ہی
قوم بنا کر پیدا کرتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا

اس لئے یہ قوموں کا اختلاف تو ہمیشہ باقی رہے گا
اور قومی عصبیتیں فنا نہیں ہوں گی۔ مگر اِس
اختلاف کو مقصدِ حیات نہ بنا کر صرف اپنا تحفظ کرتے
ہوئے وہی لوگ ایمان کے رشتہ میں منسلک
ہو کر انسانیت کو فروغ دیں گے، جن پر اللہ تعالیٰ
نے اپنا فضل و انعام کیا ہے۔

غرض نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ قومیت وحدتِ انسان کے رشتۂ
اجتماعی کی ایک خاص حالت کا نام ہے اور راستہ کی بے شمار منزلوں
میں سے ایک منزل اور بامِ انسانیت کا درمیانی زینہ ہے، جس پر مستقل
تباہی اور ہلاکت کے مرادف ہے۔

اِسلامیانِ عالم کا انتشار و انشقاق کا راز یہی ہے کہ انھوں نے
دنیا پر چھا جانے کے تھوڑے سے ہی عرصہ بعد قومی اختلافات کے بارہ میں
قرآن کی ہدایتوں کو یاد نہ رکھا۔ اور ایک قومی عصبیت نے طاقت پاکر
ملوکیت کی مسند سنبھال لی۔ اور ہر قوم کی انفرادیت کو مٹاتے ہوئے،
اسلام کے نام پر ان کو اپنی قوم میں ضم کرنا چاہا۔ ظاہر ہے کہ اس کا ردِ عمل
ہوا اور قومی عصبیتوں کے ماتحت ہر طرف خانہ جنگی نے سر اٹھایا اور جو پھر
زور پکڑا تو بگڑتی ہی چلی گئی۔ ہر گوشہ میں طوائف الملوکی اور بدامنی اٹھ کھڑی
ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھر کے رہ گیا۔ وہ مختلف
گروہ جو توحید کے مرکز پر آکر وحدتِ عالم کا نمونہ بن گئے تھے، اپنی عصبیت
کو فنا ہوتے ہوئے دیکھ کر ایک بار پھر منتشر ہو گئے۔ ان کو غالب قوت سے
مگر خلاصی کی فکر ایسی سمائی کہ اپنے لئے وحدت رشتے سے ناطہ توڑنے میں

ذرا نہ ہچکچائے۔ اور وقتی اغراض دائمی النقطاع کی بے عنوانی پر غالب آکر رہیں ــــــ اب یہاں ہمیں اس سے بھی بحث نہیں کہ اس انتشار نے ان کو کس حد تک فائدہ پہنچایا اور کس حد تک نقصان، لیکن انتشار کے صحیح صحیح علل واسباب یہی تھے کہ جو قومیت اسلام کی جڑ کاٹ کر رہے!

جنگ عظیم میں ترکوں کو اتحادیوں نے اتنا نقصان نہیں پہنچایا جتنا کہ دوسری عصبیتوں پر ترکی عصبیت کے غلبہ نے پہنچایا۔ اور یہ سراسر ترکوں ہی کی غلط روی کا نتیجہ تھا کہ اسلامی وحدت بھی اس راہ میں مصر وعراق اور شام وحجاز کو ترک دشمنی سے باز نہ رکھ سکی کیونکہ اس وقت ترکی حکومت مصر وعراق اور شام وحجاز وغیرہ ہر اسلامی وحدت کے ساتھ نہیں بلکہ ترکی عصبیت کے غلبہ کے ماتحت تھی جس سے بجا طور پر دوسری عصبیتوں کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ اور عرب خصوصیت سے ترکی قومیت کے غلبہ اور عربی قومیت کے مٹ جانے کے اندیشہ سے ترکی حکومت سے بیزار ہوتے جا رہے تھے۔ لارنس نے اس نفسیات کو سمجھا، اور ان کی بیزاری کو بآسانی نفرت و بغاوت کی خطرناکی میں مبدل کرکے پورا فائدہ اٹھالیا۔ اگر ترکوں کی عصبیت دوسری عصبیتوں پر چھاپے نہ مارتی اور ان کی حکومت وحدت اسلامی کی سچی تصویر ہوتی تو دنیا کی کوئی طاقت ان کو گزند نہ پہنچا سکتی تھی اور نہ ان کی فاتحانہ سرگرمیوں پر ذرا آنچ آسکتی تھی۔ اس نقصان عظیم کی علّت کو جب مصطفےٰ کمال کی باریک بین نظروں نے خوب سمجھ لیا تو اس نے ترکی قوم کے احیاء و استحکام سے فارغ ہوتے ہی سب سے پہلا کام یہی کیا کہ اتحاد دولِ شرق کو ایسی بنیادوں پر قایم کردیا جو آگے چل کر انشاء اللہ ضرور بارآور ہوگا!

مغرب کے اندر اتحادِ یورپ کی ہر کوشش ناکام ہوتی رہی ہے۔ مگر صلیبی جنگوں نے مخالفت اسلام کے نام پر تمام مسیحی یورپ کو آسانی سے کچھ عرصہ کے لئے متحد کر لیا تھا۔ اور یہ اتحاد بھی برپا ہو سکتا تھا۔ اگر روس عصبیت دوسری اقوام کی عصبیتوں کو پنپنے کا موقعہ دیتی۔ لیکن اس نے طاقت پاتے ہی تمام قومیتوں کو صرف اپنے اندر جذب کرنے اور اپنے آگے مغلوب کرنے کی غلطی کا ارتکاب کیا اور جس کا یہی نتیجہ ہوا کہ ہر طرف نفرت و بیزاری کی آگ بھڑک اٹھی اور ہر قومیت نے بہت جلد خواب غفلت سے بیدار ہو کر اس لعنتِ عائدہ سے پیچھا چھڑا لیا۔ اس کے بعد سے برابر اتحادِ یورپ کی ہر سعی ناشکور ہو رہی ہے۔ اور کوئی بھی اس مقصد کے قریب نہیں پھٹکتا۔ بلکہ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ۱۹۳۹ء سے وہ عالمگیر فکر شروع ہوئی ہے جو اپنے اندر سنجانے کتنی نفرتیں اور بیزاریاں رکھتی ہے اور اپنے پیچھے سنجانے کتنی نفرتیں اور بیزاریاں باقی چھوڑ جائے گی۔

وطنیت الحاد کے بھی مترادف نہیں ہے۔ یورپ میں الحاد پھیلنے کے وجوہ اس سے قطعاً جداگانہ اور بالکل مختلف ہیں۔ ترکی حکومت کا مذہب سے اعراض بھی وطنیت کی وجہ سے نہیں، بلکہ وہاں کے تنگ خیال عالموں اور جاہل صوفیوں کی بیجا سخت گیریوں کے ردّعمل کے طور پر ہوا۔ لیکن اس ردّعمل کے یہ نہایت اندوہناک باقیات ہیں کہ وطنیت کے جنون میں یورپ کی تقلید کا طوق پہننا تو ترکی نے گوارا کر لیا لیکن مذہب کو سیاست سے علیحدہ کر کے چھوڑا ــــــ ورنہ وہاں مختلف مذاہب کا اتنا اجتماع اور فرقہ وارانہ تشتت و افتراق کا

وہ ہجوم نہیں جو ہندوستان اور روس وغیرہ میں نظر آتا ہے۔

حاصل اس تمام بحث کا یہ ہے کہ قیام قومیت کے معاملہ میں مسلمانوں کے لئے اسلام کی تعلیمات کہیں حارج نہیں۔ اور نہ اس سے الحاد کا اندیشہ ہے۔ بلکہ یہ اندیشہ اس صورت میں زیادہ یقینی ہو جاتا ہے جبکہ قومیت کے مقابلہ میں خواہ مخواہ مذہب کو دست و گریبان کیا جائے۔ اسی بناء پر میرے خیال میں ہندوستانی قومیت میں دوسری قومیتوں سے کہیں زیادہ کم نقائص ملیں گے۔

ہندوستان کے لئے قومیت کا سوال، اس کی موت و زیست کے سوال جیسا ہے۔ اور اس کی ادنیٰ مخالفت ہندوستان دشمنی کے ہم معنیٰ ہندوستانی قومیت کی تشکیل سے مسلمانوں کی وحدت ملی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی۔ اور نہ اسلامیت کے شیرازہ کے بکھرنے کا بعید ترین احتمال ہے۔ ہم ہیں ہندوستانی ہونے کی حیثیت، میں ہندوستانی قومیت کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ اور مسلمان ہونے کی حیثیت میں ملت اسلامیۃ کا داعی و ساعی! مسلمان کسی اور ملت میں ضم ہونے کے لئے نہیں ہے۔ ہاں غیر مسلموں سے سیاسی معاملت اور تجارتی و معاشرتی ارتباط بھی ناجائز و ممنوع نہیں پھر یہ تو ایک مجبوری کا سودا ہے۔ جس کے بغیر چارہ نہیں۔ اور نہ اس سے بہتر کوئی اور صورت سامنے ہے۔ آزادی کے لئے قومیت غیر مسلموں سے زیادہ مسلمانوں کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ غلامی پر قناعت انھیں سرے سے مذہب ہی سے خارج کر دیتی ہے۔ ہندو اکثریت کا خوف بالکل لغو اور توہین آمیز ہے۔ قوموں کے عروج و زوال کی نفسیات اور خصوصاً اسلام کی تاریخ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ دنیا میں اکثریت و اقلیت کا مسئلہ کوئی قابل لحاظ مسئلہ نہیں ہے بلکہ

اصل چیز کمیت و کیفیت ہے۔ نصب العین کی بلندی و پستی ہی ملتوں کی بلندی و پستی ہے۔ پھر مسلمان ہمیشہ اقلیت ہی میں غالب و منصور ہوئے ہیں۔ اور ہر اکثریت کی آنکھ ان کے تیور کے آگے جھپکی ہے ——— میں اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتا اگر واقعی یہ اپنی جگہ اہم ترین نہ ہوتی ——— کیونکہ اقبال کے اس موضوع کو چھیڑنے کے بعد اس کے ہر ہر جز و پر غائر نظر ڈالنا ضروری تھی۔ اور اگر سرے سے اقبال کے اس موضوع ہی کو نظر انداز نہ کر جاتا تو سلسلۂ سخن کی درمیانی و ناگزیر کڑی کو چھوڑ جانا پڑتا۔ جو کم سے کم ایک ناقد کی حیثیت میں ہرگز میرے شایانِ شان نہیں ———

شعر و حکمت!

حق اگر سوزے ندارد حکمت است
شعر میگردد چو سوز از دل گرفت! (پیامِ مشرق)

اقبال کا منبعِ فکر صرف قرآن ہے۔ اس سے ہٹ کر اس نے کوئی چیز پیش نہیں کی۔ اس کی پکار وہی ہے جو "فاراں کی چوٹیوں سے بلند ہوئی تھی۔ اس نے انسانی مجد و شرف کے اسی قانون کو اپنی "فردوسی" زبان میں دہرایا جو ایک "یتیمؐ" اور "انسانِ کاملؐ" نے صحرائے عرب میں ریت کے کنکروں کے فرش پر بیٹھ کر آج سے تیرہ سو سال قبل ترتیب دیا تھا۔ لوگ اس ابدی قانون کو بھول چکے تھے "ترجمانِ حقیقت" نے اپنے دل نشین طرزِ بیان سے اُن کو یاد دلایا۔ زندگی کا وہ پاکیزہ نصب العین نظروں سے اوجھل ہوتا جا رہا تھا

اس "پیغمبر حیات" نے آہانہ سحر سے اس پر سے پردہ ہٹا دیا۔ اس کے پختہ افکار نے دلوں پر وہ جلا کی کہ ان کی تابندگی، پھر فرشتوں کی نگاہوں میں چکا چوند پیدا کرنے لگی۔ اس کے قلب کے گداز اور روح کی تڑپ نے سوتے ہوؤں کو جگایا اور بھٹکے ہوؤں کو راستہ پر لگایا۔ اور یہ حقیقت مسلّمہ خود ان کے ہونٹوں سے شعر بن کر ادا ہوگئی :-

صفت برق چمکتا ہے مرا فکر بلند
کہ بھٹکتے نہ پھریں ظلمت شب میں راہی (ضرب کلیم)

اگرچہ شاعری میں اقبال کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ داغ و اکبر اور حالی و شبلی جیسے مسلّم الثبوت اساتذہ کی اسناد پیش کی جا سکتی ہیں لیکن میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا کہ وہ کس پایہ کا شاعر تھا ——— یہ آتشین اندازِ بیان جو اس کو مقدر فرمایا گیا، محض شعر گوئی کے لئے وجہ افتخار نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں، جو اس طائر بلند بام کو بحور و قوافی کے تنگ پنجرے میں مقید کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ بھی صحیح راستہ پر نہیں ہیں، جو اس مرد قلندر کو صرف فلسفی سمجھتے ہیں۔ اقبال نہ محض شاعر تھا ——— نہ محض فلسفی! ——— دراصل وہ ایک حقیقت کبریٰ کا پیغامبر تھا۔ اور حسن کا ادا شناس عاشق! ——— اس کی شیریں سخنی و آتش بیانی اس کی فکر و نظر کی مستی ہے جس نے اس کا پیغام دماغوں سے گزرتا ہوا دلوں کی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ محض شاعری یا محض فلسفہ خود اس نے بھی کبھی اپنا سرمایۂ افتخار نہیں جانا ——— اس کا مطمح نظر شعر گوئی و فلسفہ سنجی نہیں ——— بلکہ "تپش اندازی" تھا۔ وہ اپنے شاعرانہ وجدانات سے فلسفہ کی پیچیدہ گتھیاں سلجھاتا اور منزلِ مقصود کے لئے سیدھا

اور آسان راستہ اختیار کرتا ہے خود کہتا ہے :-

نہ شیخ شہر نہ شاعر نہ خرقہ پوش اقبال

فقیر راہ نشین است و دل غنی دارد (پیام مشرق)

اگر اقبال زندگی کے ان حقائق کی نقاب کشائی میں جو اقوام و ملل کے کردار کو بناتی ہیں، بجائے اپنی خداداد وجدانی صلاحیتوں کے صرف عقل کا خشک موضوع اختیار کرتا تو اس کا فلسفہ محض اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ کے لئے محدود ہو جاتا اور اس کے سوز نفس سے عام سینوں میں جو حرارت آج دیکھنے میں آرہی ہے، نہ پیدا ہوتی اس لئے اس نے حل مسائل کے لئے جو وجدانی اسلوب اختیار کیا، یہ صرف اسی کا حصہ تھا اور یہی وہ طریقہ ہے جو براہِ راست دلوں کو مخاطب کرتا اور عقائد میں پختگی لاتا ہے منطقی دلائل سے انسان خاموش اور لاجواب تو ہو سکتا ہے لیکن دل کا اعتراف متاثر نہیں ہوتا۔ اسی لئے اقبال کا مقصد لوگوں کو خاموش کر دینا نہیں بلکہ دل کے اعتراف کو متاثر و شریکِ حال کرنا ہے!

اُدعُ اِلیٰ سبیلِ ربّک بالحکمۃ

والموعظۃ الحسنۃِ وجادلھم

بالتی ھیَ احسن۔ (نحل)

" اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف لوگوں کو ایسی محکم دلیل، اور نرمی کے ساتھ بلاؤ جس سے حق ثابت ہوتا ہے اور شبہات زائل ہو کر دل کا اطمینان حاصل

ہوتا ہے۔ اور اگر ان سے مباحثہ و مجادلہ کرو تو وہ بھی ایسے
دل نشین طریقہ پر جو پسندیدۂ حق ہے۔"

اقبال جو کچھ کہتا تھا اسی قرآنی تعلیم کے پیش نظر کہتا تھا، اسی لئے
اس کے مخاطب دماغ نہیں بلکہ دل ہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی دل کی زبان سے کہتا تھا
جو عشق و یقین کا قبلہ و کعبہ ہے۔ لیکن افسوس ہے ان پر جو اس کے خون و جگر
کے ظاہری نقش و نگار ہی پر بس کہہ اٹھتے ہیں اور دل کی آنکھوں سے اس
چمنستان کی خوشہ چینی نہیں کرتے۔ وہ چاہتا تھا کہ دل بیدار ہوں اور چشم
بصیرت وا ہو، جو ان نقوش کی معنویت کو سمجھے۔ اسی لئے وہ خود کو دنیا میں یکہ
و تنہا محسوس کرتا تھا۔ اور بار بار ایک ہم نفس کی آرزو میں خدا کے سامنے
گڑگڑایا کرتا تھا:—

ہر کسے از ظنِ خود شد یارِ من
از درونِ من نجست اسرارِ من!

در جہاں یارب ندیمِ من کجاست؟
نخلِ سینایم، کلیمِ من کجاست؟

شمع را تنہا تپیدن سہل نیست
آہ یک پروانۂ من اہل نیست

موج در بحر است ہم پہلوئے موج
ہست با ہمدم تپیدن خوئے موج

ہست در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

من مثالِ لالۂ صحرا ستم
درمیانِ محفلے تنہا ستم

خواہم از لطفِ تو یارب ہمدمے
از رموزِ فطرتِ من محرمے!

ہمدمے دیوانۂ فرزانۂ
از خیالِ این و آں بیگانۂ

تا بجانِ او سپارم ہوئے خویش
باز بینم در دلِ او روئے خویش (اسرار)

اس کو ہم سے سب سے بڑا شکوہ یہی رہا کہ ——— میرے شناسا ہی مجھ سے بیگانہ رہتے ہیں! میں تو ان کو شراب پلانا چاہتا ہوں اور وہ میرے خم و سبو ہی کے نظارہ میں گم ہیں۔ شاہانہ عظمت و جلال میں ان کے قدموں پر ڈالنا چاہتا ہوں اور وہ مجھ سے دلبری و دلستانی کے خواب اور گیت سننا چاہتے ہیں۔ میں حکمت و موعظت کے موتی ان کے سامنے بکھیرتا ہوں اور وہ گل و بلبل کے افسانے سننے کی آرزو لیکر آتے ہیں ——— یہ کیسے کم حوصلہ و کم نظر ہیں، جو صرف مظاہر و تخیل کے پرستار ہیں اور میری روح کی تڑپ پر ایک نظر نہیں ڈالتے:—

آشنائے من زمن بیگانہ رفت
از خمستانم تہی پیمانہ رفت!

من شکوہِ خسروی او را دہم
تختِ کسریٰ زیرِ پائے او نہم

او حدیث دلبری خواہد ز من!
رنگ و آب شاعری خواہد ز من!
کم نظر بیتابیٔ جانم ندید
آشکارم دید و پنہانم ندید
برگِ گل رنگیں ز مضمونِ من است
مصرعۂ من قطرۂ خونِ من است (پیام مشرق)

مجبور ہو کر اپنے ہی شعر کو مخاطب کر کے کہتے ہیں:۔

ہے گلہ مجھ کو تری لذتِ پیدائی کا
تو ہوا فاش تو ہیں اب مرے اسرار بھی فاش
شعلے سے ٹوٹ کے مثلِ شرر آوارہ نہ رہ
کر کسی سینۂ پرسوز میں خلوت کی تلاش! (ضرب کلیم)

لیکن جب کہ قرآن عظیم جیسی بلاغت، حکمت و موعظت، ہدایت و رحمت اور نور اُعلیٰ نور کی ضیا باریوں سے کم ہیں کہ جو قلب کی گہرائیوں کو منور کرتے ہیں تو پھر اقبال اور پیام اقبال کس گنتی شمار میں ہے، لیکن اس کی ساری کوشش یہی رہی کہ قرآن کی تعلیمات کو کسی طرح ہماری زبان میں بیان کر دے چنانچہ شعر میں اس نے وہی اسلوب اختیار کیا جس کی قرآن نے تعلیم دی ہے اور اس کو اس نے مستیٔ فکر، جذب نظر اور عشق و وجدان وغیرہ سے تعبیر کیا ہے:۔

حیات کیا ہے خیال و نظر کی مجذوبی
خودی کی موت ہے اندیشہ ہائے گوناگوں! (بال جبریل)

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری (بالِ جبریل)

تڑپ رہا ہے فلاطون میانِ غیب و حضور
ازل سے اہلِ خرد کا مقام ہے اعراف (")

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف! (")

وہ عقل کو عشق و وجدان کے تابع رکھتا ہے:۔

من بندۂ آزادم عشق است امامِ من
عشق است امامِ من، عقل است غلامِ من (زبورِ عجم)

عقل و عشق کے اس باریک فرق کو کس خوبی سے ادا کیا ہے جو اقبال ہی کا حصہ ہے:۔

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد
سالکِ رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ! (بالِ جبریل)

کیونکہ ضعفِ یقین کا علاج صرف عقل سے نہیں ہو سکتا کہ عقل شک و گمان کی خالق ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اپنے دلائل آپ ہی توڑتی رہتی ہے۔ ہر زبردست دلیل اس کے پہلے کلیہ کی قاطع قطعی نظر آتی ہے:۔

علاجِ ضعفِ یقیں ان سے ہو نہیں سکتا!
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق! (بالِ جبریل)

زماں زماں شکند آنچہ می تراشد عقل
بیا کہ عشق مسلماں و عقل زناری است (زبورِ عجم)

عقلے کہ جہاں سوزد، یک جلوۂ بیباکش
از عشق بیاموزد، آئینِ جہانتابی!
عشق است کہ در جانت ہر کیفیت انگیزد
از تاب و تبِ رومی تا حیرتِ فارابی
ایں حرفِ نشاط آور می گویم و می رقصم
از عشق دل آساید، با ایں ہمہ بیتابی
ہر معنیٔ پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بدل در شو، شاید کہ تو دریابی (پیامِ مشرق)

خرد ہوئی ہے زمان و مکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الٰہ الا اللہ! (ضربِ کلیم)

اور جب تک کہ یقین و اعتماد حاصل نہ ہو، کوئی مفید تحقیق عالمِ وجود میں نہیں آسکتی۔ لرزتا ہوا دل کسی انکشاف کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ ڈگمگاتے ہوئے قدم کسی رَوِش پر لطفِ خرام نہیں پاسکتے۔ اور کم یقینی کا اجتہاد لذتِ سرمدی حاصل نہیں کرسکتا:۔

بے یقیں را لذتِ تحقیق نیست
بے یقیں را قوتِ تحقیق نیست
بے یقیں را رعشہ ہا اندر دل است
نقشِ نو آوردن اورا مشکل است (زبورِ عجم)

لیکن وہ عقل کو بالکل از کار رفتہ بھی نہیں گردانتا، بلکہ عقل و وجدان و عشق و عرفان میں امتزاج پیدا کرکے شاہراہِ فطرۃ اللہ کی تلاش میں مدد لیتا ہے۔ چونکہ عقل محض ظواہر پہ سر دھنتی ہے، بطون کی سرمستی تک

اس کی رسائی نہیں۔ اور اس کی نظر گویا مغز کے بجائے پوست پر آکر رک جاتی ہے۔ قرآن نے موجودات پر غور کرنے کے لئے عقل کو بار بار مخاطب ضرور کیا ہے، —— "کیا تم نہیں دیکھتے"؟ —— کیا تم نہیں سمجھتے؟ —— "تم سمجھو اور غور کرو"! وغیرہ وغیرہ! لیکن حیات و روحانیات کے عالم کے لئے صاف الفاظ میں ظاہر کر دیا ہے کہ:۔

وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً۔

(بنی اسرائیل)

"تم یہ مت سمجھو کہ تم عقل میں کامل ہو گئے ہو، ہر جگہ یہ چراغ
نہیں جلایا سکتا۔ کیونکہ تم کو بہت تھوڑا اور بہت کم
علم دیا گیا ہے"

رہ عاقلی رہا کن کہ باو تواں رسیدن

بہ دلِ نیاز مندے بہ نگاہِ پاکبازے! (پیام مشرق)

لیکن موجودات کی دنیا بھی اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے کہ فکر ونظر کو ذکر وعشق کی رہبری و ہدایت حاصل ہو، جو عین الیقین اور حق الیقین ہے۔

کلا سوف تعلمون ثم کلا سوف
تعلمون۔ کلا لو تعلمون علم
الیقین۔ لترون الجحیم ثم
لترونها عین الیقین ثم لتسئلن
یومئذٍ عن النعیم۔ (تکاثر)

"کوئی نہیں، آگے جان لوگے، پھر بھی کوئی نہیں اور تم
آگے جان لوگے، اگر یقین کر کے جانو تو اور کوئی نہیں؟"

چمن میں تربیتِ غنچہ ہو نہیں سکتی
نہیں ہے قطرۂ شبنم اگر شریکِ نسیم!

وہ علم، کم بصری جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ کلیم!

(ضرب کلیم)

دنیا کے مفکرین میں اقبال کا درجہ بہت بلند ہے، وہ کسی کی تقلید نہیں کرتا، بلکہ ایک بلند ٹیلے پر کھڑا ہوا فطرت الٰہی کی دوربین سے ہر ایک کے خرام تفکر کا بغور جائزہ لے رہا ہے۔ جو راہرو جادۂ فطرت پر جس حد تک گامزن نظر آتا ہے اقبال اسی قدر اس کی ہمت افزائی کرتا ہے، سراہتا ہے اور راستے سے ہٹے ہوئے قدموں کی لغزش پر سختی سے ٹوک دیتا ہے اس کے علاوہ تمام خطوط پر خطِ تنسیخ کھینچتا ہوا، اپنا نغمۂ فطرت بلند کرتا ہے ———

اِقبال کے نزدیک اِنسان کا منتہائے کمال یہ نہیں ہے کہ اپنی ہستی کو فنا کر کے، ہستی مطلق میں جذب کر دیا جائے۔ بلکہ شرفِ اِنسانیت یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر زیادہ سے زیادہ شان دلفریبی اور قوتِ انجذاب پیدا کر کے، ذاتِ مطلق کو اپنے میں جذب کرے۔ چنانچہ مسئلہ وحدت الوجود کے منتہائے مقصود قرار دے لینے کو وہ حیات کے لئے سمِ قاتل سمجھتا ہے۔ اگر زندگی کا نصب العین اسی مسئلہ کو مان لیا جائے تو:-

"تخلقوا باخلاق اللہ"

کا مفہوم اصلی معدوم ہو جاتا ہے۔ اسی لئے وہ ہیگل پر سخت نکتہ چینی کرتا ہے
جو اس مسئلہ کا زبردست حامی تھا۔ اور اس کی کاوش فکر کو مست و خایہ گیر
بے خروس مرغی سے تشبیہ دیتا ہے:۔

طائرِ عقلِ فلک پرواز او دانی کہ چیست
ماکیاں کز زورِ مستی خایہ گیرد بے خروس! (پیامِ مشرق)

افلاطون کو اس نے "راہبِ دیرینہ" اور "ایکے از گروہ گوسفندانِ
قدیم" کہا ہے۔ کیونکہ اس کا فلسفۂ حیات میں تابندگی نہیں لاتا، بلکہ موت کی
نیند سلانے کی لوری دیتا ہے، وہ افلاطون کی نشاۂ پرستی پر لعنت بھیجتا
ہے جس نے دنیا کے ایک کثیر طبقہ کو گمراہ اور حیاتِ دنیوی سے غافل
و متنفر کر دیا ہے۔ خاص کر اسلامی ادبیات اور علوم و فنون پر بہت گہرا
اثر ڈالا ہے، اقبال کو سب سے بڑا اعتراض افلاطون کے مسئلۂ "اعیان"
پر ہے جس کی رو سے وہ مادہ کو ازلی مانتا اور حیات کی تگ و دو کو روح
کے اپنے مبدا کی طرف لوٹنے اور ایک جزو کے کل میں فنا ہو جانے کو
ثابت کرتا ہے۔ اس نے افلاطون کو رہبانیت کا معلم اسی لئے کہا ہے
کہ وہ اس دنیا کو بالکل بے حقیقت اور فریب نظر کہتا ہے۔ وہ موت
کی تلقین کرتا اور ایک دوسری خیالی دنیا کا نقشہ اس انداز پر کھینچتا ہے
کہ لوگ اس سے بے انتہا اثر پذیر ہو کر زندگی سے متنفر ہو جاتے ہیں۔
اور یہ تنفر، تعطل و جمود میں بدل کر ان کو بے حس و بے عمل بنا دیتا ہے
حالانکہ زندگی ہی سب کچھ ہے، اور زندگی نام ہے استقلالِ عمل
و مستقل حرکت کا ——— !

راہبِ دیرینہ افلاطوں حکیم
از گروہِ گوسفندانِ قدیم!
گفت سرِّ زندگی در مردن است
شمع را صد جلوہ از افسردن است
بر تخیلہائے ما فرمانروا است!
جامِ او خواب آور و گیتی رباست
عقل او را بر سرِ گردوں رساند
عالمِ اسباب را افسانہ خواند!
منکرِ ہنگامۂ موجود گشت!
خالقِ اعیانِ نامشہود گشت!
قوہا از سکرِ او مسموم گشت
خفت از ذوقِ عمل محروم گشت!

(رموز)

مشرق کی سرزمین اپنی زرخیزی و لطافت کے لحاظ سے تشائم و قنوطیت کی نمو و پرورش کے لئے کچھ خاص طور پر موزوں تھی۔ یہاں اس سکر آور فلسفہ کو زیادہ عروج حاصل ہوا اور بیشتر مفکرین نے اس کی آبیاری کی، یہاں کی تمام پیداوار پر یہی دھندلا رنگ چھایا ہوا ہے اور زندگی کا ہر شعبہ اس سے متاثر ہے۔ لیکن مغرب کی سرزمین آب و ہوا حزن و یاس کی ہمت افزائی کے لئے کچھ زیادہ سازگار نہ تھی۔ اس لئے وہاں کی فضا میں یہ مسموم خیالات زیادہ نہیں پنپ سکے، ورنہ تشائمین و متشائمین کی وہاں بھی کمی نہیں ہے۔ مذہب تشکیک کے حامیوں میں

ہربرٹ اسپنسر بہت آگے بڑھا ہوا ہے اور یاس پسند اور حزن دوست متشائمین میں شوپنہار ایک نمایاں حیثیت رکھتا ہے ——— جس کے نزدیک زندگی کی بنیاد ہی یاس و قنوط پر ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گویا ہندوستان کے مہاتما گوتم بدھ نے مغرب میں شوپنہار کے روپ میں دوبارہ جنم لے لیا ہے۔

شوپنہار کے نزدیک زندگی نام ہے جبر مسلسل اور اول سے آخر تک مایوسیوں اور حسرتوں کے خونچکاں المناک کا۔ وہ کہتا ہے کہ قوت تخلیق، مشیت کا ایک اندھا ارادہ ہے۔ اور انسان صرف مصائب کا شکار ہونے، زندگی کی بوجھل گاڑی کو رو رو کر گھسیٹنے اور بالآخر ناکامی کی موت مرجانے کے لئے پیدا ہوا ہے۔ ہر طرف موت کی گرم بازاری ہے۔ اور ہر گوشہ میں اندھیرا ہے تمنائیں اور آرزوئیں اور ہر قسم کے جذبات زندگی کے دکھ کو زیادہ کرنے والے اور دل کے ناسوروں میں اضافہ کرنے والے ہیں۔ زندگی کے حاصل کچھ آنسو ہیں ۔ اور کچھ نہیں ——— پھر چونکہ شوپنہار ایک بے مثل ادیب بھی تھا، اس لئے اس کے نظریات زندگی نے ادب کی چاشنی پاکر حیرت انگیز قبول عام حاصل کیا تاہم مغرب کی سرزمین اس سے اتنی زیادہ متاثر نہ ہوئی جس قدر کہ مشرق اور خصوصاً ——— ہندوستان ہوا ——— ؛

متفادل اقبال کی نظر میں یہ تعلیم نہایت ملعون اور مشیت کی انتہائی توہین ہے۔ رنج و الم کو اقبال نے جس نظر سے دیکھا اس کی تشریح تو آگے آئیگی یہاں پر صرف وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔ جس میں اس نے نہایت دلچسپ انداز میں شوپنہار کا نیٹشے سے مقابلہ کیا ہے۔ اور بتلایا ہے کہ شوپنہار کی قنوطیت پسندی کا سبب یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کی طرف سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ اسلئے

کائنات کی وسعت ونشیب وفراز میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ اور زمانہ کی اصلیت اس پر نہیں کھلتی ــــــــ اس کو ہر موج طوفان عظیم ایسے دکھائی دیتی ہے کہ وہ اپنے اندر کی ہلچل نہیں دیکھتا۔ اور اس طرح زندگی کے تمام نعائم اپنے اوپر حرام کرلیتا ہے۔ اگر وہ پہلے خود کو پہچاننے کی سعی کرتا تو زمانہ کی حقیقت اس پر بے نقاب ہوجاتی۔ اور پھر زندگی کی یہی رکاوٹیں جن کو وہ آلامِ حیات ومصائب زندگی کہتا ہے، اور خود ہی خوف سے تھرتھرا اٹھتا ہے اس کے لئے خودکشی کی وجہ جواز بننے کے بجائے حیات افروز ثابت ہوتیں

مرغے ز آشیانہ بہ سیرِ چمن پرید
خارے زشاخِ گل بہ تنِ نازکش خلید!
بدگفت فطرتِ چمن روزگار را
از دردِ خویش وہم زغمِ دیگران تپید!
گفت این سرا کہ بنایش نہادہ کج
صبحے کجا کہ چرخ دروشا مہا نہ چید
داغے زخونِ بے گنہے لالہ را شمرد
اندر طلسمِ غنچہ فریبِ بہار دید!
نالید تا بحوصلہ آن نوا طراز
خون گشت نغمہ وز دو چشمش فروچکید
سوز فغانِ او بدل ہدہدے گرفت
با نوکِ خویش خار ز اندام او کشید!
گفتش کہ سودِ خویش زجیبِ زیاں برآر
گل از شگافِ سینہ زرِ ناب آفرید!

در مان ز درد ساز اگر خستہ تن شوی

خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی! (پیام مشرق)

مغربی حکما میں صرف نیٹشے اور برگسان ہی کو اقبال کسی حد تک اپنا ہمنوا پاتا ہے، اس نے "پیام مشرق" میں جس طرح گوئٹے کے کمالات کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ اسی طرح ان دونوں کو بھی سراہا ہے۔ مگر جہاں سے ان کے تخیل میں بھونڈا پن پیدا ہوتا ہے اس پر فوراً انگلی رکھ دی ہے۔ بعض حضرات اس مغالطے میں ہیں کہ اقبال اپنے نظریات میں انھی دونوں فلسفیوں کا پیرو اور خوشہ چین ہے، اگر ذرا دقتِ نظر سے مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال کا منبع فکر صرف قرآن ہے۔ فکر و نظر کی تھوڑی بہت مماثلت کسی پیغمبر کی پیغمبرانہ حیثیت پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتی۔ حقیقت ہر زمانہ میں ایک ہی رہی ہے۔ صرف اس کے نام اور اندازِ گفتگو وغیرہ ضرور بدل گئے ہیں۔ اور بدلتے رہیں گے۔ لیکن حقیقت فی نفسہٖ کسی طرح نہیں بدل سکتی۔ اگر کوئی شخص بالکل نرالی اور اچھوتی چیز کی پیش کش کا مدعی ہے تو وہ سب کچھ ہو سکتا ہے۔ مگر حقیقت شناس کبھی نہیں ہو سکتا۔ اقبال نے پرزور طریقوں سے مختلف موقعوں پر اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

نیٹشے فرد کی یکتائی کو تسلیم کرتا ہے، خواہشِ اقتدار اور جوشِ نمو کو کائنات میں جاری و ساری دیکھتا ہے، اور مقابلہ خطرات اور آویزشِ آلام کو تعمیرِ فردیت کے لوازم کو گردانتا ہے۔ وہ علم و فن کو اسی حد تک مفید کہتا ہے جس حد تک وہ بقائے حیات میں معاون رہیں۔ اس نے مسیحی فلسفۂ اخلاق کے خلاف نہایت شدید جد و جہد کی اور بالآخر اسی میں اپنی جان دی۔ اس کی نظر میں یہ مذہب اخلاقیات کا دشمن اور رہبانیت کا علمبردار ہے۔ جس کے ذریعہ کسی قوم کی

تزکیۂ اخلاق نہیں ہو سکتا۔ اس کی مسیحیت دشمنی نے کلیسا کی بنیادیں ہلا دی تھیں اور ذہنیتوں میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اقبال نے اس کے اس "جہاد" کو "دیوانہ بکار گہ شیشہ گراں رسید" کہکر ظاہر کیا ہے۔ کیونکہ عام طور پر نیٹشے کے متعلق دیوانگی کا بھی شہرہ تھا۔ وہ مستقبل بعید میں ایک "فوق البشر" کے ظہور کی خبر دیتا ہے، جو انسانی ترقی کی آخری منزل ہے، یہ فوق البشر ظاہر ہو کر مسیحیت کو بالکل ملیامیٹ کر دیگا۔ انسانوں کو ان کے صحیح نصب العین سے آگاہ کریگا۔ اور زندگی کو بہتر بنائیگا۔

لیکن جہاں سے اس کے قدم جادۂ فطرت سے ہٹتے ہیں، ان میں سب سے پہلے تو اس کا نسلی تعصب ہے۔ جس کے زیر اثر وہ نوع انسانی کو "آقا و غلام" کی دو صفوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ مسیحی ———— یعنی صبر و تحمل اور فرمانبرداری وغیرہ ———— جس کو اس نے دنیا کی سب سے بڑی لعنت اور دامن انسانیت کا داغ کہا ہے۔ اس کی پیروی غلاموں کے لئے تجویز کرتا ہے، اور اپنا مخاطب صرف طبقۂ امراء کو قرار دیتا ہے۔ اور اسی طبقہ سے بہترین افراد کی نشو و نما اور تربیت کو فوق الانسان کے ظہور کا پیش خیمہ بتلاتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی مقصد اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے نزدیک نہ دنیا اچھی ہے، نہ بری ———— اور نہ ہی اس کی کوئی غرض و غایت ہے۔ بلکہ صرف مادہ کی قوت تخلیق کا ایک زبردست مظہر ہے، جس میں وہ بغیر کسی غرض و غایت کے مختلف صور و اشکال میں متبدل ہوتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بقائے روح کا بھی قائل نہیں۔ اقبال اس کا سبب یہ بتلاتا ہے کہ خدا کے انکار نے زمان کے متعلق اس کے تصور کو غلط راستہ پر ڈال دیا ہے۔ اور اس نے زمانہ کے اخلاقی پہلو کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر نیٹشے کی انفرادیت بھی اس حد تک بڑھی ہوئی ہے کہ وہ

اجتماعیت و جمہوریت کو کسی حیثیت سے تسلیم نہیں کرتا۔ بلکہ شخصی اقتدار کی پر زور حمایت کرتا ہے۔ اسی لئے وہ یورپ میں جمہوریت کو مٹانا چاہتا ہے لیکن اقبال انفرادیت کو اسی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے کہ وہ اجتماعیت کی تشکیل میں زیادہ سے زیادہ معاون ہو۔ مغربی جمہوریت کا اقبال بھی دشمن ہے، مگر شخصی اقتدار کی حمایت کے لئے نہیں، بلکہ اس لئے کہ اس کی بنیاد صرف معاشی اور اقتصادی وسعت پر رہی ہے۔ جو ہوس پرستی و سرمایہ داری کی پشت پناہی کر رہی ہے۔ وہ اس کے مقابلہ میں اس سے بہتر اسلام کی جمہوریت کو رکھتا ہے، جس میں مادیت کو روحانیت کے تابع رکھا گیا ہے۔

ان امور کے پیش نظر اقبال نے نیٹشے کے متعلق بالکل ٹھیک کہا ہے کہ اس کا دل تو بیشک مومن ہے لیکن دماغ کافر کا فر رہی ہے۔ اس نے حرم کے نقشہ پر ایک کعبہ کی تاسیس تو کرنا چاہی، مگر اس کے لئے چند بت بھی تجویز کر دیئے۔

گر نوا خواہی ز پیش او گریز
در نئے کلکش غریو تندر است

نیشتر اندر دل مغرب فشرد
دستش از خون چلیپا احمر است

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت
قلب او مومن دماغش کافر است

خویش را در نار آں نمرود سوز
زانکہ بستان خلیل از آذر است (پیام مشرق)

برگسان کے نظریات بھی قریب قریب یہی ہیں۔ وہ تغیر و انقلاب کو زندگی کے لوازم شمار کرتا ہے، بلکہ اس کے نزدیک کائنات کی بنیادی حقیقت ہی

انقلاب ہے، اور زندگی اسی تسلسل تغیر کی ایک کڑی ہے، اور شوپنہار و نیٹشے کی
طرح اس کے خیال میں بھی کائنات کا ارتقا تخلیقی ایک غیر ذی شعور قوت ہے، جس
کے پیش نظر تسلسل حیات کے لئے کوئی مقصد اور کوئی نصب العین نہیں ہے،
برگساں حقیقت کی نقاب کشائی میں عقل پر مطلق بھروسہ نہیں کرتا۔ وہ عقل
وخرد کی دل کھول کر دھجیاں اڑاتا ہے۔ اور انکشاف حقائق میں صرف
"وجدان" کو خضر راہ بناتا ہے۔ اقبال بھی عقل کو آگے نہیں رکھتا مگر اس کو
بالکل بیکار کہکر اس کی طرف سے منہ بھی نہیں موڑلیتا۔ اس کے نزدیک عقل پر
بھروسہ کرنا خطرناک ہے۔ اور عقل اسی وقت تک گمراہ ہے جب تک عشق
کی محکوم نہ ہو۔ حقیقت کا سراغ اسی وقت مل سکتا ہے کہ "عشق" کی مشعل
روشن کرکے وجدان کا عصا ہاتھ میں لیا جائے۔ اور عقل کو ان کے زیر فرمان
صرف چلنے کی ہدایت کی جائے۔ اس طرح عشق، وجدان اور عقل کے اس
امتزاج کا نام اقبال کے یہاں "تفکر" ہے چنانچہ وہ برگساں کو مخاطب کرتے
ہوئے کہتا ہے:۔

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است
عقلے بہم رساں کہ ادب خوردۂ دل است (پیام مشرق)

معرفت حق کا بہترین ذریعہ "تصوف" ہے کیونکہ تصوف نام ہے، سراپا عشق
وعمل کا، مگر عجمیت کے غلبہ نے تصوف کے چہرہ پر بھی باطل کی نقاب ڈالدی ہے۔ اس
کے اصلی خد وخال کو چھپا دیا ہے، اور اس کی روح عمل سلب کرلی ہے۔ مولانا روم
اور شیخ سعدی وغیرہ دو ایک صوفیوں کے سوا سب نے تصوف کو غلط طریقہ پر
پیش کیا اور ان کی نظر زندگی کے تاریک پہلو پر رہی۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال اکثر
صوفیائے کرام کا معتقد ہے، اور اپنے افکار میں مرشد رومی کو ہادی و رہبر بنائے ہوئے

بھی تصوف کی شدید مخالفت کرتا ہے۔ اس کے افکار سے علاوہ تصوف میں صف ماتم بچھ گئی، اور ہر طرف سے اس پر کفر و دہریت کی بوچھار ہونے لگی تھی۔ کیونکہ اس نے صوفیا کے ناجائز اقتدار پر سخت حملہ کیا تھا اس عجمیت کی بنیادیں ہلا دی تھیں ــــــــ

تصوف کے دل و دماغ پر جو موت کی حکمرانی ہے، اور جمود و تعطل اور یاس و قنوط کا غلبہ ہے، یا عملیت سوز مستی و رنگینی چھائی ہوئی ہے، یہ نتیجہ ہے فلسفۂ یونان سے اثر پذیری اور ویدانت کے خلط ملط کا ــــــــ تصوف کا فلسفہ " ہمہ اوست" اس کے نزدیک نامحمود ہے کیونکہ انسان کی خودی اس سے شدید طور پر مجروح ہوتی ہے، اور وہ ہر سمت ہمہ اوست کے مشاہدہ میں اپنی ہستی کو بھول جاتا ہے اور آخر میں دنیا سے بیزار و متنفر ہو کر جد و جہد کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتا ہے۔ اور صرف موت کو وصل کا مترادف سمجھتا ہے۔ یہ اس کی معنوی خودکشی ہے ــــــــ اقبال نے اس جمود و بے حِسی کے خلاف مسلسل آواز بلند کی ہے اور اس کے تمام مکروہ خد و خال کو بے نقاب کیا ہے۔

اقبال کے نزدیک یہ عملیت کو سوخت کرنے والا تصوف اقوام مغلوبہ کا ایک کامیاب ہتھیار ہے جس کے ذریعہ وہ غالب سخت کوش اقوام پر حملہ آور ہو کر ان کی روح کو ذبح کر ڈالتی ہے۔ اس کو اس نے ایک تمثیل کے ذریعہ واضح کیا ہے، کہ ایک سرسبز چراگاہ کی رہنے والی چند گایوں پر، جن کا وظیفۂ حیات صرف پیٹ بھرنا اور نرم نرم گھاس پر آرام کرنا تھا، چند شیروں نے حملہ کیا۔ اور گایوں پر مصائب و آلام کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک عقلمند گائے نے جو اپنی قوم کی تباہی پر سخت ملول اور آمادۂ انتقام تھی، سوچا کہ گایوں کو تو کسی صورت سے شیر نہیں بنایا جا سکتا البتہ حسن تدبیر سے شیر کو گائے بنا دیا جا سکتا ہے وہ فوراً صاحب الہام

صوفی بن کر شیروں کے پاس آئی اور ان پر اپنے تصوف والہام کا سکہ بٹھاتے ہوئے نفیِ خودی اور ضعف و بیچارگی کی تلقین کی :-

ہر کہ باشد تند و زور آور شقی است
زندگانی محکم از نفیِ خودی است

روحِ نیکاں از علف یابد غذا
تارکُ اللحم است مقبولِ خدا!

جنت از بہرِ ضعیفان است و بس
قوت از اسبابِ خسران است و بس

جستجوئے عظمت و شوکت شر است
تنگدستی از امارت خوشتر است

ایکہ تو نازی بذبحِ گوسفند
ذبح کن خود را شوی تا ارجمند

سبزہ پامال است و روید بار بار
خوابِ مرگ از دیدہ شوید بار بار

غافل از خود شو اگر فرزانہ
گر ز خود غافل نۂ دیوانہ

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
تا رسد فکرِ تو بر چرخِ بلند

ایں علف زارِ جہاں ہیچ است ہیچ
تو بہ ایں موہوم اے نادان مپیچ

(اسرار)

سخت کوشی سے تھکے ہوئے شیر تن پرستی پر مائل تھے، یہ سکر آور الہام سن کر آرام سے لیٹ گئے، اور اپنی جد وجہد اور عملیت کو ترک کر کے "سلوک طے کرنے لگے" نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑے عرصہ بعد ان کی "جسم میں لرزہ ڈالنے والی آنکھوں کی شرر فشانی اور مخالف کو زیر کرنے والی دانتوں کی تیزی جاتی رہی اس کے قوائے عمل مفلوج اور فولادی اعصاب نرم و سست ہو گئے، دلوں پر افسردگی و پژمردگی چھا گئی ہمت نے جواب دیدیا، جان کا خوف غالب آگیا، وہ سینکڑوں اوہام و وساوس اور امراض جسمانی و روحانی کا شکار ہو گئے، ان کا عزم و استقلال، عزت و وقار، اور جلال و جبروت سب تباہ ہو گیا۔ وہ مذہب شیری بھول کر دین گوسفندی میں داخل ہو گئے۔ اور ان کی حمیت و غیرت پر وہ موت طاری ہوئی کہ اس تمام پستی و دوں فطرتی کو عین تہذیب و اصل انسانیت سمجھنے لگے ——

شیر بیدار از فسونِ میش خفت
انحطاط خویش را تہذیب گفت (اسرار)

مطلب اس حکایت سے یہ ہے کہ نفی خودی اثبات موت اور دونیت وپستی کی مظہر ہے۔ یہ تعلیم اخلاق کو ضعیف اور ہمت کو پست کرتی ہے۔ اس حکایت میں تصوف کے عجمیت آمیز رجحانات اور افلاطونیت و ویدانت کی انفعالیت کو خلاصہ کے طور پر بیان کر دیا گیا ہے —— اب آیئے اقبال کی روشِ فکر کو قرآن کی روشنی میں دیکھیں! ——

اسلام کا آفتاب ایسے وقت میں طلوع ہوا جبکہ دنیا کی تمام پرانی تہذیبوں پر یاس و قنوط کے بادل منڈلا رہے تھے اور ہر طرف جمود و دبیجسی کا غلبہ تھا۔

حکمتِ یونان اور فلسفۂ عجم کو افلاطونیت کی دیمک لگ چکی تھی۔ ہندوستان میں ویدانت کے "آتما" و "مایا" کے جال کو گوتم بدھ نے اور مضبوط اور ہمہ گیر بنا دیا تھا۔ اور مغرب میں عیسائیت و کلیسا کے زیرِ اثر رہبانیت کے بت کو پوجا جا رہا تھا ——

زندگی و عمل کی اس خشک سالی میں صحرائے عرب کے تپتے ہوئے اور لامحدود ریتیلے میدانوں سے حیات کا وہ زمزم پھوٹا جس نے صدیوں کی مردنی، بےحسی اور جمود و تعطل کو دیکھتے ہی دیکھتے دھو ڈالا۔ وہ ایک بجلی کا کڑکا تھا جس نے اونگھتے ہوؤں کو چونکا دیا، وہ زندگی کا ایک طوفان تھا جس نے قبر کی بوسیدہ ہڈیوں کو زندہ کر کے رزمگاہِ حیات میں دوڑا دیا۔ جہد و سعی اور کامیابی و کامرانی کے اس پیغام کو سن کر امیدیں جاگ اٹھیں اور یاس و نامرادی کا چہرہ مرجھا گیا —— ہمت و نصرت کے اس سورج کی کرنوں نے حزن و خوف کی اوس کو اڑا دیا۔ اور دنیا نئے سرے سے جوان بن گئی۔ اس کی تعلیم سراسر بیداری و یقین کی تعلیم تھی اور اس کی پکار سعی و عمل کی پکار تھی لیکن آس پاس کی ہدلیاں رفتہ رفتہ زندگی و عمل کے اس آفتاب کے قریب بھی آنے لگیں، شام و فلسطین کے کلیساؤں نے اس کو متاثر کیا۔ فلسفۂ یونان نے گھن لگایا، عجم کے تعیش و زرتشتیت نے اپنا رنگ چڑھایا اور آخر میں ہندوستان میں آ کر تو گویا اسکے عمل کا جنازہ ہی نکل گیا۔ اور حقیقت پھر روپوش ہو گئی۔ کیونکہ اگرچہ دنیا کی تمام قدیمی تہذیبوں پر یاس و قنوط کا غلبہ تھا، مگر یورپ کی آب و ہوا نے اس کی جڑوں کو مضبوط نہیں ہونے دیا بلکہ وہ روحانیت سے اس حد تک گریزاں ہوا کہ صرف مادیت ہی کو اپنا نصب العین ٹھہرا کر ہلاکت کی چادر اوڑھ لی ——
ایران میں بھی یہ پودا کچھ زیادہ سرسبز نہیں ہوا، مگر ہندوستان کی فضا تو خاص طور پر

اس کے لئے سازگار تھی جس نے دنیا کو زیر و زبر کرنے والے شیروں کو تھوڑے ہی عرصہ میں مکمل طور پر گوسفندی کے دین کا پیرو بنا دیا ——

اب ہر طرف سے یہی صدائیں اٹھنے لگیں کہ: —— اپنے آپ کو فنا کر دو، —— مرنے سے پہلے مر جاؤ —— یہ دنیا نیکوں کے رہنے کی جگہ نہیں، —— یہاں کی ہر چیز ہیچ ہے —— موت کو ہر وقت پیش نظر رکھو —— اور ہر چیز سے نفرت و بیزارگی کا اعلان کر دو —— زندگی کے حقائق سے منہ موڑ لو، —— کسی طرف مت دیکھو اور کچھ نہ سمجھو، —— مشکلات و مصائب کے سامنے گردن جھکا دو، —— ہر ذلت و پستی کا بخندہ پیشانی استقبال کرو کہ یہی نفس کا سب سے بڑا مجاہدہ ہے —— خود کو نہایت حقیر و ذلیل اور کمزور و عاجز بنا لو کہ بندۂ عاجز و لاچار مقبول خدا ہے، —— تنگ دستی و افلاس اور بے بسی ایک نعمت عظمیٰ ہے —— اور دولت و حکومت اور علوم و فنون سب شیطان کی فریب کاریاں ہیں —— اور یہاں کی ان تمام محرومیوں کا نعم البدل جنت ہے! ——

اقبال اس کے خلاف آواز بلند کرتا ہے کہ یہ خود فراموشی فنا کا راستہ ہے —— زندگی کا راستہ خود شناسی ہے —— اپنی خودی سے غافل ہونا ہی مردود، بارگاہ ہونا ہے، اور قرآن کے خلاف عمل کرنا ہے ——

"فانساھم انفسھم اولئک ھم الفاسقون۔ (حشر)

" پس وہ لوگ اپنے ہی نفس کی طرف سے غافل ہو گئے ہیں

یہی وہ لوگ ہیں جو دونوں جہان کے گھاٹے اور ٹوٹے میں
رہیں گے۔"

گر فنا خواہی ز خود آزاد شو!
گر بقا خواہی بخود آباد شو!
چیست مردن! از خودی غافل شدن!
تو چہ پنداری فراقِ جان و تن؟
از خودی اندیش و مردِ کار شو!
مردِ حق شو، حاملِ اسرار شو! (اسرار)

تصوف و سلوک پہلا مرحلہ فنائے ذات کی تعلیم دیتا ہے کہ یہ عالم دو مافی العالم سب نظر کا دھوکہ اور مایا ہے، بلکہ ہم خود بھی کچھ نہیں ہیں۔ تصوف نے ـــــــ "لا الٰہ الا اللہ" کی نفی لا کو خود اپنے ہی اوپر استعمال کیا، اور اثباتِ الا کو بھول گیا۔ حالانکہ نفیِ لا باطل اور ظلم و طغیان کے لئے تھی، مخالف قوتوں کو زیر کرنے اور ماسوا اللہ کو مٹانے کے لئے تھی۔ اور اثباتِ الا کائنات کا پردۂ اسرار چاک کرنے کے لئے، تعمیر مدنیت کے لئے، معرفتِ ذات کے لئے اور اعترافِ حق کے لئے! ـــــــ مگر آواز اٹھتی ہے تو یہ کہ ـــــــ

بالیقین من نیم و ہم گمانم باقیست

اقبال کہتا ہے کہ عشق و یقین کے آئینہ میں دیکھو تو معلوم ہوگا کہ میں ہوں اور اتنا بسیط ہوں کہ زمان و مکان میں نہیں سما سکتا۔

در بود و نبودِ من اندیشہ گماں ہا داشت   از عشق ہویدا شد این نکتہ کہ ہستم من

عشق کی اِک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں (بال جبریل)

اور صرف ہوں ہی نہیں ـــــــ بلکہ میری ہستی جاودانی ہے۔ اور یہ جو کچھ نظر آتا ہے، سب میرے لئے ہے۔ مجھی سے اس کی رونق ہے، یہ آفتاب و مہتاب ـــــــ یہ آسمان و زمین، ـــــــ یہ دریا و پہاڑ سب میرے غلام ہیں ـــــــ میں عناصر پہ فرمانروا ہوں ـــــــ میرا حکم کائنات پر چلتا ہے۔

" وسخر لکم ما فی السموات
و ما فی الارض جمیعا " (جاثیہ)

" خدا نے تمہارے ہی لئے تمام آسمان و زمین اور
ان میں کی تمام چیزیں مسخر و محکوم کر دی ہیں "

شرر بہ پیرہ رنگم گداز جلوۂ من
کہ بہ تاب یک دو آنے تب جاودانہ دارم
(زبور عجم)

ہنگامۂ ایں محفل از گردش جام من
ایں کوکب شام من، ایں ماہ تمام من (")

زہرہ گرفتار من، ماہ پرستار من
عقل کلاں کار من، بہر جہاں دارو گیر

من بہ زمین در شدم، من بفلک بر شدم
بستۂ جادوئے من، ذرّہ و مہر منیر (پیام مشرق)

"من تو شدم، تو من شدی" کی تربیت آمیزی، خودی کو مجروح کرتی ہے ــــــــ کمالِ انسانیت یہ ہے کہ خودی پر اتنی جلا کیجائے کہ ہر چیز کو جاذب و مسخر کرلے، حتیٰ کہ خدا کو بھی ــــــــ مشہور حدیث ہے :۔

"جس نے اپنی ذات کو پہچانا، اس نے معرفتِ حق حاصل کی

"من عرف نفسہ، فقد عرف ربہ"

پیدا بضمیرم او، پنہاں بضمیرم او
انیست مقام او این است مقام من

خودی پر عشق و محبت سے جلا ہوتی ہے، اور عشق کو اقبال نے بہت وسیع معنی میں استعمال کیا ہے، جس سے مشاہدات کو جزو ذات بنایا جاتا ہے۔ اور نصب العین کو سامنے رکھ کر اس کے حصول کی سعی کی جاتی ہے، عشق خودی کو فنا نہیں کرتا، اور جس شئے سے خودی پر دباؤ پڑے وہ عشق نہیں ہے کیونکہ عشق کی خاصیت یہ ہے کہ وہ عاشق اور معشوق حقیقی یا فرد یکتا کے درمیان انفرادیت پیدا کرتا ہے، اور اس کو اپنے میں جاذب کرتا ہے۔ اگر عشق کی کسی کیفیت کو گم شدگی کہا جاسکتا ہے تو وہ کیفیت بہت ہی عارضی ہے، جس کا استقلال عشق و خودی کی موت ہے۔ انسان عشق کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ دل میں بالیدگی و شوق کا بیج بوتا ہے۔ خود اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کائنات کے لئے جاذب و تسخیر کی مجھ میں کتنی اہلیت و طاقت ہے۔ پھر اپنے کو زیادہ سے زیادہ اس کا اہل بناتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں عشق، رہبر کامل ہے۔ اور ساز حیات کا ہر تار اس مضراب سے نغمہ ریز ہوتا ہے۔

جب عشق سکھاتا ہے، آدابِ خود آگاہی
کھلتے ہیں غلاموں پر اسرارِ شہنشاہی

(بالِ جبریل)

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات
عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات

صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق (بالِ جبریل)

عشق کے عروج و کمال کے لئے اس کی تہذیب و تربیت کے مدارج اور اس کے زوال کے اسباب کو ملاحظہ فرمائیے:-

جمالِ عشق و مستی نے نوازی
جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدرؓ
زوالِ عشق و مستی حرفِ رازیؒ (بالِ جبریل)

عاشق کی صحیح تعریف اور اس کا مقام :-

عاشق آں نیست کہ لب گرم فغانے دارد
عاشق آں است کہ برکف دو جہانے دارد
عاشق آنست کہ تعمیر کند عالمِ خویش
در نسازد بجہانے کہ کرانے دارد (زبورِ عجم)

نالہ و فغاں سے عشق میں خامی آتی ہے، اور اس کی قوت کمزور ہوتی ہے
عشق جوہرِ حیات کو چمکاتا ہے، لیکن خود اس جوہر کے لئے نہایت پاکیزہ اور گہرے

ظرف کی ضرورت ہے۔ ضبطِ فغاں اگر نہ ہو تو یہ سوزش، حیات کو بھی پھونک ڈالتی ہے
اور آخر میں اس کی قوتِ انجذاب زائل کر کے راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہے:۔

لب فرو بند از فغاں در ساز با دردِ فراق
عشق تا آہے کشد از جذبِ خویش آگاہ نیست (زبورِ عجم)

نالہ و آہ کی اسی حد تک اجازت ہے کہ یہ شعلہ بے قابو نہ ہو جائے، یا محبوب
سے قربتِ دوام حاصل نہ ہو، کیونکہ عشق اور رفاقت میں بعد المشرقین ہے:۔

اگر نہ بوالہوسی با تو نکتۂ گویم
کہ عشق پختہ تر از نالہ ہائے بے اثر است

(زبورِ عجم)

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد
خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز (")

عشق کی اس تپشِ جاودانی اور لذتِ نارسائی سے اگر نوری مخلوق واقف
ہو جائے، تو وصلِ دوام سے اکتا کر انسانی سوز و ساز کے لئے مچلنے لگے ۔۔۔ ے

مقامِ شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انھیں کا کام ہے یہ، جن کے حوصلے ہیں زیاد (بالِ جبریل)

اگر ایں نامہ را جبریل خواند
چو گرد آں نورِ ناب از خود فشاند

بنالد از مقام و منزلِ خویش
بہ یزداں باز گوید از دلِ خویش

تجلّی راچناں عریاں نخواہم
نخواہم جز غمِ پنہاں نخواہم
گذشتم از وصالِ جاودانے
کہ بینم لذتِ آہ و فغانے
مرا ناز و نیازِ آدمی دہ
بجانِ من گدازِ آدمی دہ (زبورِ عجم)

نظر کو رنگینیٔ عرفان اور فکر کو کیفِ یقین، اسی عشق و وجدان سے حاصل ہوتا ہے اور قدم خود بخود شاہراہِ فطرت کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ صوفیا نے اس سے صرف مستیٔ اقوال حاصل کی حالانکہ عشق کا دوسرا نام مستیٔ کردار ہے، جو چٹانوں میں گداز پیدا کرتی ہے، عقل کے معنی پس وپیش اور ہچکچاہٹ کے ہیں۔ حالانکہ سفرِ حیات میں بیشتر گھاٹیاں وہ آتی ہیں جہاں صرف مجاہدانہ عزم و بیباکی اور رندانہ جراءت و اقدام سے کام لیا جاتا ہے:۔

ہر دو بمنزلے رواں، ہر دو امیرِ کارواں
عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست
لیکن ایں بیچارہ را آں جراءتِ رندانہ نیست (زبورِ عجم)

عقل کا ریگستان عشق کے ہی دستِ بہار آفریں سے نخلستان بنتا ہے اور اسی سراب میں سے آبِ شیریں کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔ اگر عقل کو عشق کے ماتحت نہ رکھا جائے تو وہ نفس کے زیرِ فرمان آجاتی ہے اور بہت جلد پستیٔ اخلاق کی ترغیب اور بہیمانہ خواہشات کی زیب و زینت بن جاتی ہے۔ علم سے عقل و دماغ پر جلا ضرور ہوتی ہے، مگر دانائیٔ راہ کے لئے وہ عصمتِ نگاہ اور عفتِ قلب

نہیں حاصل ہوتی جو فقر و عرفان کا طرۂ امتیاز ہے:۔

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد
فقر کا مقصود ہے عفتِ قلب و نگاہ

علم فقیہہ و حکیم فقر مسیح و کلیم
علم ہے جویائے راہ فقر ہے دانائے راہ

(بال جبریل)

دل ہو غلامِ خرد یا کہ امامِ خرد!
سالک رہ ہوشیار! سخت ہے یہ مرحلہ! (" ")

عشق و عرفان کا نتیجہ یقین و اعتماد ہے، اور عقل کا شک و گمان۔ اور ظاہر ہے کہ یقین و اعتماد سے جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں، وہم و گمان ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچتے:۔

"ان الظن لا یغنی من الحق شیئا"

" جان لو کہ گمان کبھی یقین کا فائدہ نہیں دیتا"

شاہم تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

اقبال گمان و شک کا سخت ترین دشمن ہے، کیونکہ اوہام و شکوک زندگی کو دیمک بن کر چاٹ جاتے ہیں۔ اس کے فلسفہ کی بنیاد اسی یقین و اعتماد پر ہے وہ دلوں میں خود اعتمادانہ عزم و حوصلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جس سے روح میں تازگی اور عمل میں چستی آتی ہے اور نظر کائنات کی گہرائیوں میں تیر جاتی ہے۔

ناموس ازل را تو امینی تو امینی!
دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی!

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی!
صہبائے یقین درکش و از دیر گماں خیز
از خواب گراں، خواب گراں خواب گراں خیز!
از خواب گراں خیز!!

صاحبانِ عزم و یقین کے لئے قرآن نے ان الفاظ میں بشارت دی ہے۔

" ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم
استقاموا تتنزل علیہم الملائکۃ
الا تخافوا وابشروا بالجنۃ التی
کنتم توعدون نحن اولیاءکم فی
الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ ولکم
فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا
ما تدعون نزلا من غفور الرحیم"
(حم سجدہ)

" جن لوگوں نے اقرار کیا کہ صرف خدائے واحد ہی ہمارا پروردگار
ہے اور پھر اپنے کاموں کے اندر اس اعتقاد و اعتماد کا ثبوت
دیکر عزم و استقامت اور یقین و ایمان کا درجہ حاصل
کر لیا اللہ کی طرف سے ان پر طمانیت قلبی اور سکون سرمدی
کے فرشتے نازل ہوں گے اور ان کو اطمینان بخشیں گے

کہ اب نہ تو تم کسی طرح کا خوف اپنے دل میں لاؤ اور نہ غمگین ہو
اور اس جنت کی پر نعمت زندگی میں رہو جس کا تم ایسے یقین
اور بھروسہ کرنے والوں سے وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم دنیا کی
زندگی میں بھی تمہارے مددگار ہیں اور آخرت میں بھی تم کو
طاقت و اختیار بخشندیا گیا۔ اب جس چیز کو تمہارا جی چاہے
تمہارے لئے مہیا ہے، اور تم اللہ سے جو بھی مانگو گے
مل جائے گا۔ یعنی فتح و نصرت تمہارے قدم چومے گی
یہ درجہ تم کو خدائے غفور الرحیم کی طرف سے تمہارے
یقین و استقامت، تمہاری موحدانہ بے خوفی و بے باکی
اور تمہارے اعمالِ صالحہ و جہدِ مسلسل کے صلہ میں
مرحمت کیا گیا ہے"۔ ؎

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

(بالِ جبریل)

ہر مشکل کا حل خود اعتمادی و یقین کا وہی اقدام ہے، جس میں سینۂ عشق
کی حرارت شامل ہو:۔

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقینِ محکم، عملِ پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں!

(بانگِ درا)

اب دیکھئے کہ اس یقین و اعتماد کی کارفرمائیاں کس انتہا کو پہنچتی ہیں؟ اور اس کی ہمہ گیری کس طرح زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو جاتی ہے؟۔

قرآن نے اگرچہ علم و حکمت کو خیر کثیر کہا ہے، اور عالم کو جاہل، لیکن اس علم کو کہیں نہیں سراہا جس میں عمل نہ ہو اور اس سے اخلاق کی تربیت نہ ہوتی ہو، کیونکہ علم در اصل پیداوار ہے عمل کی، اور حیات کے لئے وہ اسی وقت تک مفید ہے کہ عمل کے تابع رہے۔ عربوں کے یقین و عمل کو جگانے کے لئے رسول اللہ نے کوئی مسلم ادارۂ علمیہ قائم نہیں کیا تھا، بلکہ سب سے پہلے ان کو توحید کی دعوت دی تھی جو سراسر عمل ہے، اس لئے وہی علوم و فنون قابل اعتماد ہیں جو عمل و حریت کے دست پروردہ ہوں، بے عملی و غلامی کا علم ہمیشہ خواب آور ہوتا ہے اللہ نے اپنی نیابت کا وعدہ ان لوگوں سے نہیں کیا جو محض عالم ہیں بلکہ اس نے ہر جگہ صاحبان عمل سے خطاب کیا ہے:۔

"وعد اللہ الذین آمنوا منکم

وعملوا الصلحت لیستخلفنھم

فی الارض" (نور)

"تم میں سے جو لوگ صاحب ایمان و یقین ہیں اور اعمال صالح کے عامل ہیں، خدا ان سے وعدہ کرتا ہے کہ ان کو زمین پر اپنی خلافت و نیابت عطا فرمائے گا"

اسی لئے اقبال کو مابعد الطبیعیات سے اتنی دلچسپی نہیں جتنی کہ اخلاقیات سے ہے، وہ علم کو اچھا کہتا ہے، لیکن عمل کو اس سے اچھا۔ اور اس علم کو وہ گھاس کے تنکے سے بھی کم قیمت سمجھتا ہے، جس سے روح عمل سست ہو اور جو ہر یقین ماند پڑ

وہ ایسے تمام علوم و فنون پر جو خواب آور ہیں، لعنت بھیجتا ہے، کیونکہ وہ بربادی اور موت کی دعوت دیتے ہیں۔ اور زندگی کے حقائق سے غافل کرتے ہیں۔ کیونکہ آرٹ کا صحیح مصرف یہی ہے کہ اس سے خودی پر جلا ہو، انسان کی قوت یقین جاگ اٹھے اور اس میں خود اعتمادی و سخت کوشی کی روح تڑپنے لگے، لہذا آرٹ کا یہ نظریہ بہت ہی گمراہ کن ہے کہ آرٹ محض آرٹ کے لئے ہے:۔

سن آں علم و فراست با پرکاہے نمی گیرم
کہ از تیغ و سپر بیگانہ سازد مردِ غازی را!

(زبورِ عجم)

صاحبانِ یقین کے ذوقِ عمل کے نزدیک یہ نظریہ کسی حیثیت سے قابل تعریف نہیں کہ:۔

حدیثِ مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمہ را

وہ کہتے ہیں کہ یہ تعلیم قرآن کے خلاف ہے، یہ معمہ ہمارے سامنے اسی لئے رکھا گیا ہے کہ صرف ہم ہی اس کو کھول سکتے ہیں۔ ہماری حیات کی تابندگی اسی میں ہے کہ اس عقدہ کشائی میں اپنی جد و جہد کو آخری سانس تک جاری رکھ کر نیابت الٰہی کے حقدار بن سکتے ہیں۔ یہ کائنات فریب نظر بلکہ اصل حقیقت ہے۔ اس میں خدا کی نشانیاں ہیں اور سب سے بڑا عالم خود انسان کے اندر پوشیدہ ہے:۔

" سنریھم آیتنا فی الآفاق و فی انفسھم " (حٰم سجدہ)

" ہم اپنی نشانیاں عالم ہی کے مختلف اطراف و جوانب میں

دکھلائیں گے، اور خود انسان کے نفس میں بھی ـــــــ"

مکان کے ساتھ زمان کی حقیقت بھی معرفت نفس سے بے نقاب ہو جاتی ہے۔

" ان فی خلق السمٰوات والارض

واختلاف الیل والنھار لاٰیاتٍ

لاولی الالباب " (آل عمران)

" آسمان و زمین کی خلقت میں اور اختلاف لیل و نہار یعنی تغیرات و انقلابات زمان میں ارباب فکر و بصیرت کے لیے بہت سی نشانیاں پوشیدہ ہیں ـــــــ"

شوپنہار، نیٹشے، اور برگسان وغیرہ کا یہ مذہب بھی تعلیمات قرآنی کے سراسر خلاف ہے کہ کائنات کا نظام تخلیقی مشیت کا ایک اندھا ارادہ ہے یا مادہ کے بے مقصد ارتقائی مدارج ہیں۔

" الذین یذکرون اللہ قیامًا وقعودا

وعلیٰ جنوبھم ویتفکرون

فی خلق السمٰوات والارض ربنا

ماخلقت ھٰذا باطلا " (آل عمران)

" وہ لوگ جن کا دل بیدار ہے اور جو اپنے پروردگار کو اٹھتے بیٹھتے لیٹتے غرض ہر حالت میں یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمان

وزمین کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو ان پر اسرارِ حیات
منکشف ہو جاتے ہیں، پھر وہ کہتے ہیں اور یقین کرتے ہیں
کہ بیشک اے پروردگار تو نے یہ جو کچھ پیدا کیا ہے اُن
میں سے کوئی چیز بیکار اور فضول نہیں بنائی، بلکہ ہر
پیدائش کے لئے ایک خاص مقصد اور نصب العین
رکھدیا ہے۔"

اگر ارتقائے تخلیقی کا کوئی مقصد تسلیم نہ کیا جائے تو اس سے انسان کے عمل پر دباؤ پڑتا ہے۔ کیونکہ ایک لغو و فضول چیز کے لئے دماغ سوزی و جانکاہی سب سے بڑی لغویت اور نادانی ہے۔ انسان کسی چیز کے لئے اسی وقت سرگرم کوشش کرتا ہے، جب اس کو یہ یقین ہو کہ کائنات کی یہ چیز غیر ارادی طور پہ محض تفریح کے لئے نہیں بنائی گئی ہے۔ اور اس میں میرا فائدہ ہے پھر اس علم و سائنس کے دور میں اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ کائنات کی تمام اشیاء صرف انسان کے استفادہ کے مقصد کو پیش نظر رکھ کر بنائی گئی ہیں:۔

ایکہ از تاثیرِ افیوں خفتۂ
عالم اسباب را دوں گفتۂ
خیز و واکن دیدۂ مخمور را
دوں مخواں ایں عالم مجبور را
حق جہاں را قسمتِ نیکاں شمرد
جلوہ اش با دیدۂ مومن سپرد
نائبِ حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود! (اسرار)

بے یقینی و بے عملی کی جب یہ آواز اٹھتی ہے کہ :۔

چشم بند و گوش بند و لب بہ بند
گر نہ بینی سرِّ حق بر ما بخند!

تو یقین فوراً للکارتا ہے :۔

چشم و گوش و لب کشا اے ہوشمند
گر نہ بینی راہ حق بر من بخند! (رموز)

صاحب عزم و یقین مثل ایک تلوار کے ہے جو خدا کے ہاتھ میں ہو اور کائنات اس تلوار کے لئے سنگِ فسان ہے۔ اس لئے دنیا کے حقائق سے روگردانی کفرانِ نعمت ہے۔ اور کائنات کی پیچیدگیوں سے گھبرا کر اس کو فانی اور زندگی کو ناقابل اعتنا کہنا انسانی مجد و شرف کے لئے شرم اور عزم و یقین کی توہین ہے۔ خدا نے انسان کو سب سے برتر و اعلیٰ بنایا اور ہر چیز کو اس کا تابع فرمان کر دیا ہے :۔

"ولقد کرمنا بنی آدم وحملناھم
فی البر والبحر ورزقناھم من الطیبٰت"

(بنی اسرائیل)

"ہم نے انسان کو تمام چیزوں پر عزت و بزرگی بخشی
خشکی و تری کی ہر چیز کو حکم دیا کہ اس کی مطیع ہو جائیں
اور اس کو اٹھا لیں اور اس کے لئے دنیا میں بہترین
اشیاء سے روزی پیدا کی ——————"

آدمی شمشیر و حق شمشیر زن
عالم این شمشیر را سنگ فسن
شرق حق را دید و عالم را ندید
غرب در عالم خزید و از حق رمید
چشم بر حق باز کردن زندگی است
خویش را بے پردہ دیدن زندگی است
بندہ چوں از زندگی گیرد برات
ہم خدا آں بندہ را گوید صلات (جاوید نامہ)

عزم و یقین یاس و نامرادی کا دشمن ہے، اس آفتاب کی تیز و روشن کرنیں حزن و خوف کی اوس کو اڑا لیجاتی ہیں۔ کیونکہ غم و یاس اور خوف و نامرادی علم و عرفان میں زوال پیدا کرتی اور تیز رفتار قدموں میں سیسہ پلا دیتی ہے اللہ کی رحمت انھیں پو نازل ہوتی ہے جو اپنے پہلو میں نڈر دل لئے ہوئے کوششوں کو جاری رکھتے ہیں۔ فتح و نصرت کے جھنڈے کے وہی مالک ہوتے ہیں جو امید و یقین کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے ہیں۔

" لا تقنطوا من رحمۃ اللہ "

" اگر تم سخت کوش اور عمل دوست ہو تو اللہ کی رحمت سے
کسی حال میں امید کا رشتہ نہ توڑو "

اور " لا تحزن ان اللہ معنا " (توبہ)

" مت ڈرو کیونکہ خدا ہر وقت ہمارے ساتھ ہے "

نہ ہو نومید، نومیدی زوالِ علم و عرفاں ہے
امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں (بال جبریل)

جن کا عزم و یقین کسی مقام پر نا امید نہیں ہوتا اور کسی چیز سے بجز خدا کے خوف نہیں کھاتا، قرآن ان کو دائمی کامرانی اور غلبہ کے مژدے سناتا ہے:۔

"ولا تھنوا ولا تحزنوا وانتم

الاعلون ان کنتم مومنین"

"مت ڈرو اور مت غمگین ہو، اگر تم صاحب ایمان ویقین

ہو تو بالآخر تم ہی سب پر غالب رہو گے" اقبال کہتا ہے:۔

دل بیباک را ضرغام رنگ است

دل ترسندہ را آہو پلنگ است

اگر بیمے نداری بحر صحرا ست

وگر ترسی بہر موجش نہنگ است (پیام مشرق)

یقین کا دوسرا نام طاقت ہے، اور اقبال قوت وطاقت کا پرستار ہے قوت وطاقت کی تعریف "خودی وبے خودی کے عنوان میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ کہنا ہے کہ اقبال قوت کی پرورش و بقا کے لئے پیکار و تصادم کی تلقین کرتا ہے کیونکہ طاقت خود انسان ہی کے اندر پوشیدہ ہے۔ جو صرف اعصاب کی ورزش سے ابھرتی ہے، جسمانی ورزش پیکار و تصادم کی طرح روحانی پیکار و ورزش ضروری ہے۔ جس سے روح میں قوت اور یقین میں پختگی آتی ہے جسمانی وروحانی اعصاب کی ورزش کے لئے مخالف قوتوں سے جنگ اور خطرات کا مقابلہ بہت ضروری ہے۔ کیونکہ زندگی کی موجیں جب تک خطرات کی چٹانوں سے نہیں ٹکراتیں ان میں جوش وروانی اور قوت وطاقت نہیں آتی۔ لیکن قوت کے لئے یہ مستلزم نہیں کہ کمزور پر ظلم کیا جائے۔ اس لئے

اقبال روحانی طاقت کو جسمانی طاقت سے افضل تر کہتا ہے۔ اور ان تمام جنگوں پر لعنت بھیجتا ہے جو دنیا میں حرص جہانگیری و جوع الارضی کی خاطر برپا کیجاتی ہیں۔ مگر اس جنگ کی پر زور حمایت کرتا ہے اور حق پرستوں کو اس کے شمول کی دعوت دیتا ہے جو حق و انصاف کے نام پر باطل کی بیخ کنی کے لئے اور سرکشی کے خاتمہ کے لئے لڑی جائے۔

قال را بگذار و باب حال زن
نور حق بر ظلمت اعمال زن!
از قبائے خسروی درویش زن
دیدہ بیدار و خدا اندیش زن
صلح شر گردد چو مقصود است غیر
گر خدا باشد غرض، جنگ است خیر
ہر کہ خنجر بہر غیر اللہ کشید
تیغ او در سینۂ او را ہ دید

(اسرار)

کسی کا اس دنیا میں صرف پیدا ہو جانا ہی، اس کو زندگی کا حقدار نہیں بناتا تاوقتیکہ وہ قوت و طاقت سے اس دنیا میں اپنے لئے جگہ نکال کر اپنی زندگی کا ثبوت نہ دے۔ کیونکہ دنیا مستقل ایک رزمگاہ ہے، اس جگہ جنگ آزمائی، سخت کوشی اور جہد مسلسل کا نام ہی زندگی ہے۔ ہر گوشہ میں تصادم ہے اور ہر طاقت مصروف پیکار ہے۔ ہر دانہ زمین کا سینہ چیرڈالنے کے لئے تڑپ رہا ہے اور ہر موج دوسری موج کو پیچھے ڈھکیل کر آگے نکل جانا چاہتی ہے۔ اس ہنگامۂ دار و گیر د بست و کشاد میں انجمن آرائی

وبزم آفرینی کے لئے اگر کوئی وجہ جواز ہو بھی سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ پہلے سے زیادہ جوش وخروش کے ساتھ زور آزما ہونے کے لئے تازہ دم ہو لیا جائے۔ مستقل طور پر ہتھیار کھول کر لیٹ جانا موت کی نیند کو دعوت دینا ہے ـــــــ اس جنگاہ میں کمزوری و بے بسی کے لئے کوئی جگہ نہیں، کوشش، مسلسل کوشش اور آخری سانس تک کوشش ـــــــ یہی زندگی کا راز ہے :-

" لیس للانسان الا ما سعیٰ " (والنجم)

" انسان کچھ نہیں ہے، مگر اس کی کوشش ہی اس کو سب کچھ بنا سکتی ہے ـــــــ "

دنیا میں سب سے زبردست استحقاق صرف طاقت ہے، قوت ہر حجت سے بے نیاز ہے، بلکہ خود ایک حجت قاطع ہے۔ اور مظلوم سب سے بڑا ظالم ہے، جو ظلم کرنے کا دوسروں کو موقع دیتا ہے ـــــــ ظلم کو گوارا کرتا رہتا ہے ـــــــ ایک ہی مرتبہ کوشش پیہم سے ظالم کا لہو نہیں پی جاتا۔ جو خود کو کمزور بناتا اور اپنے کو حقیر و ذلیل جانتا ہے ـــــــ ہر طاقت کو حق ہے کہ اس کو غلام بنالے، اور اسے پیس پیس کر فنا کر دے۔ بیچارگی و بے دست و پائی ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی فطرت سزا دیئے بغیر نہیں چھوڑتی زندگی کا خوش ذائقہ پھل انھیں کو نصیب ہوتا ہے جن کے ارادوں میں سستی اور حوصلوں میں پستی نہیں ہوتی ـــــــ کامیابی کی راہیں انھیں پر کھلتی ہیں، جن کے طاقت ور پاؤں تھکنا اور مضبوط بازو عمل کا دامن چھوڑنا نہیں جانتے۔ اور فتح و نصرت انھیں کے قدموں کو چھوتی ہے جن کے سینے بلند عزائم سے معمور رہتے ہیں :-

" ان اللہ لا یغیر ما بقوم

حتیٰ یغیروا ما بانفسھم۔ (رعد)

"اس میں کوئی شک نہیں کہ خدا اس قوم کی حالت میں
کبھی کوئی بہتر تبدیلی نہیں کرتا جو خود اپنے نفوس میں
تغیر نہ پیدا کرے، اور بیچارگی و پستی کی لعنت کو دور
کرنے کے لئے خود کمربستہ ہو ———"

اقبال نے اس حقیقت کو ایک جگہ دلنشین تمثیل کے ذریعہ بیان کیا ہے یعنے کسی بھنے ہوئے تیز کو دیکھ ابوالعلاء معری کی زبان سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں کہ:-

اے مرغکِ بیچارہ ذرا یہ تو بتا تو
تیرا وہ گنہ کیا تھا یہ ہے جس کی مکافات

افسوس صد افسوس کہ شاہین نہ بنا تو
دیکھے نہ تری آنکھ نے فطرت کے اشارات

تقدیر کے قاضی کا یہ فتوے ہے ازل سے
ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

(بال جبریل)

وہ نوجوان کو سخت کوشی اور عمل پیہم پر ابھارتا ہے اور ان کے سامنے بجائے قمری و بلبل جیسے نرم ونازک پرندوں کے بلند پرواز قناعت دوست، خلوت پسند اور سخت کوش عقاب باہمت شاہین کی مثال سامنے رکھتا ہے:-

عقابی روح جب بیدار ہوتی ہے جوانوں میں
نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

نہیں تیرا نشیمن، قصر شاہی کے گنبد پر
تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں (بال جبریل)

صاحبانِ عزم و یقین کے لئے قرآن نے خطرات و مصائب کی حقیقت کو بھی صاف الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ ان کی زندگی میں خاص اہمیت ہے، یعنی ستیزہ کاری و مقابلۂ خطرات، یقین و استقامت کی آزمائشیں اور قوت کے استحکام و پرورش کے لئے اعصاب کی ورزشیں ہیں :-

" ولنبلونكم بشيءٍ من الخوف
والجوع ونقصٍ من الاموال و
الانفس والثمرات و بشر الصابرين
الذين اذا اصابتهم مصيبة قالوا
إنا لله وإنا اليه راجعون اولئك
عليهم صلوٰة من ربهم
ورحمته واولئك هم المهتدون "
(البقرہ)

" اور یہ وقتی خوف اور رکاوٹیں، بھوک پیاس کی تکلیفیں اور جان و مال کے نقصانات کیا ہیں؟ یہ جن کو تم مصائب عظمیٰ سمجھ کر جی چھوڑ دیتے ہو، یہ درحقیقت مصائب نہیں بلکہ تمہارے جذبۂ ایمانی کی آزمائشیں ہیں۔ اور

تمہاری قوتِ عمل اور جذب و تسخیر کی شمشیر کے لئے صیقل
ہیں، پس دائمی کامرانی ان لوگوں کے لئے ہے جو مصائب
حیات سے بددل ہو کر ہمت نہیں ہار دیتے۔ اور جب
ان کے سامنے رکاوٹیں آتی ہیں تو ان کے عزائم مسکرانے
لگتے ہیں۔ قوائے عمل انگڑائیاں لیتے ہیں اور وہ اس وقت
یہ کہتے ہوئے تصادم حیات میں حصہ لیتے ہیں کہ ہم اور ہمارا
عمل صرف اللہ ہی کے لئے ہے، اور ہم سب اسی کی طرف
لوٹ جانے والے ہیں۔ چنانچہ یہی لوگ ہیں جن پر خدا اپنی
محبت اور مہربانی کے پھول برساتا ہے، ان کی قوت
یقین اور ان کے طاقتِ عزم کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور
ان پر فتح و نصرت کے دروازے کھول دیتا ہے۔"

"بمیزند و بزو و زندہ تر شو!" (پیام مشرق)

اقبال اسی قرآنی تعلیم کے پیشِ نظر مصائب و آلام کی ستیزہ کاری
میں حیاتِ جاوداں کو دیکھتا ہے:

رفیقش گفت، کاے یارِ خردمند
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است! (پیام مشرق)

خطرات اور رکاوٹیں زندگی کی طاقت کے لئے بہت ضروری ہیں۔ بلکہ
زندگی کا آرٹ ہی یہ حوادث روزگار ہیں۔ کیونکہ اگر زندگی کی راہ میں کوئی رکاوٹ
نہ ہو تو ایسی یکساں و ہموار زندگی بالکل پھیکی اور بے مزہ ہے۔ جس سے خودکشی میں
زیادہ لذت ہے۔ مصیبت ایک تازیانہ ہے، فرسِ حیات و عمل کی تیزگامی کے لئے
اگر تکلیف نہ ہو تو قوت و طاقت کو ابھرنے کا موقع نہیں ملتا اور خودی مردہ ہو جاتی ہے۔

مخالف قوتوں سے پیہم جنگ کرنے، حوادث کی چٹانوں سے بار بار ٹکرانے اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتے رہنے کا نام ہی زندگی ہے، ہر گھاٹی اسی لئے سامنے آتی ہے کہ اس کو عبور کر کے تازگی و شگفتگی حاصل کی جائے ——— اگر رات نہ ہو تو صبح کی لطافت خاک میں مل جائے۔

تصادم و ستیزہ کاری سے دل میں نئی نئی امنگیں پرورش پاتی ہیں، اور رکاوٹیں زندگی کی رگوں میں شباب کا گرم گرم خون دوڑا دیتی ہیں۔ ؎

خطر تاب و تواں را امتحان است

عیار ممکنات جسم و جان است! (پیام مشرق)

راحت و مصیبت فطرت کے دو مثبت اور منفی تار ہیں جن کے ملنے سے حیات کا شعلہ بھڑکتا ہے۔ ناکامی اور رنج و الم ہی میں کامرانی و عیش و مسرت پوشیدہ ہے۔ اگر مصیبت نہ ہو تو راحت بے معنی ہے۔ جب تک انسان ناکامی اور رنج و الم سے دوچار نہیں ہوتا، اس میں پختگی اور اصابت رائے نہیں آتی۔ اس کی نظر فطرت کی بلندیوں اور گہرائیوں پر اسی وقت جاتی ہے کہ اس کا دل درد آشنا ہو فتح کی حقیقی لذت اسی وقت مل سکتی ہے، اور اس کی اصلی قیمت جب ہی معلوم ہوتی ہے کہ کبھی کبھی مفتوح بھی ہوتا رہے، لیکن جو ایک مرتبہ شکست کھا کر ہمت ہار بیٹھا اس کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے:۔

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے، ترا آئینہ ہے وہ آئینہ

جو شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

(بانگ درا)

موجِ غم پر رقص کرتا ہے حبابِ زندگی

ہے الم کا سورہ بھی جزوِ کتابِ زندگی

ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نا دیدہ ہو بلبل وہ بلبل ہی نہیں
آرزو کے خون سے رنگیں ہے دل کی داستاں
نغمۂ انسانیت کامل نہیں غیر از فغاں
حادثات غم سے ہے انساں کی فطرت کو کمال
غازہ ہے آئینۂ دل کے لئے گرد ملال!

(بانگ درا)

اخلاق و اعمال کی بنیاد نہ تو خیر محض پر ہے، نہ شر محض پر۔ انسان کی فطرت میں دونوں شامل ہیں۔ اب انسانیت کا کمال یہ ہے کہ شریر قوتوں سے جنگ کرکے ان پر غالب آجائے، یعنی ان قوتوں کو بالکل فنا نہیں کرتے بلکہ ان کو اپنے قابو میں لے کر مفید تر بنائے اور راہ عدل و اوسط اختیار کرے۔ راہ عدل وہ باریک راستہ ہے جس پر سے ایک انچ ادھر ادھر ہو جانے پر تمام اچھائیاں برائیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ یہی اصل ستیزہ کاری ہے:۔

"لقد خلقنا الانسان فی احسن
تقویم ثم رددناہ اسفل
سافلین الا الذین آمنوا وعملوا
الصلحت فلھم اجر غیر
ممنون" (والتین)

"ہم نے انسان کو ایک طرف تو بہترین قوتوں کی ترکیب اور اعلیٰ ترین جذبات کی ساخت میں پیدا کیا پھر دوسری طرف اس کو بہیمی خواہشوں، اور شریر قوتوں کے لحاظ سے ادنیٰ درجہ کی مخلوق تک لوٹا لائے، لیکن وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے اور اعمال صالحہ و عادلہ اختیار رکھے ان کے لئے بے انتہا اجر ہے۔ کیونکہ وہ بھلائی اور برائی کی افراط و تفریط سے بچ کر اور ان متضاد قوتوں کی کشاکشی سے نکل کر وسطی راہ فطرت اختیار کریں گے ــــــ"

انسان کو بہیمی خواہشیں اور شریر قوتیں بھی ایک خاص مصلحت کے ماتحت دی گئی ہیں، ان کی اصلی قدر و قیمت اسی وقت معلوم ہوتی ہے کہ ان کی تربیت کر لی جائے۔ اس وقت یہ طاقتیں تکمیل انسانیت میں حسنات سے زیادہ مفید ثابت ہوتی ہیں اس لئے انسان نہ تو مجبور محض ہے، نہ مختار کل۔ وہ کسی حد تک مجبور رہے، اور کسی حد تک مختار رہا اور اپنے اعمال و اخلاق کا پورا پورا ذمہ دار رہے۔ بلکہ وہ مجبور کم ہے، اور مختار زیادہ کیونکہ اللہ نے صرف موت و زیست پر اس کو قدرت نہیں دی۔ باقی تمام چیزوں کا مختار بنا دیا۔ اسی مختاری و ذمہ داری کا نام خلافت اللہ فی الارض ہے، اور یہی وہ " امانت" ہے جس کو انگیز کرنے سے ہر مخلوق نے انکار کر دیا تھا۔ اور اس کے تصور سے کانپ اٹھی تھی۔

وہ لوگ جو انسان کو مجبور محض سمجھتے ہیں یا ارتقا و تخلیق کو مشیّت کا اندھا ارادہ خیال کرتے ہیں، ان کے لئے بیشک دنیا میں بجز رنج و الم، ناکامی و نامرادی، اور مصائب و تکالیف کے سوا کچھ نہیں ــــــــ اور زندگی ان کی نظر میں گناہ عظیم و عذاب الیم ہے۔ کیونکہ انھوں نے زندگی کے صرف تاریک پہلو کو ہی دیکھا اور تصویر کے دوسرے دلکش رُخ پر ان کی نظر ہی نہیں

پڑی اور یوں وہ اپنی بہترین قوتوں سے غافل ہوتے جاتے ہیں ——— اب اس اندھیرے میں وہ صرف ٹھوکریں کھا کھا کر گرنے اور گر اپنے اور چیختے رہنے ہی کو زندگی سمجھے ہوئے ہیں۔ کیونکہ مشعلِ حیات سے ان کی نگاہیں آگاہ ہی نہیں ——— :

" والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا و عملوا الصٰلحٰت۔ (والعصر)

" گزرتا ہوا وقت شاہد ہے کہ بیشک انسان بہت ہی ٹوٹے اور گھاٹے میں ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے کوئی نامرادی و ناکامی نہیں جو صاحب ایمان و یقین ہیں اور جو اعمال صالحہ و عادلہ اور اخلاق حسنہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی جن کی نظر زندگی کے دونوں پہلوؤں پر ہے اور وہ درمیانی راہ پر گامزن ہیں نہ توان پر مادیت کا غلبہ ہے، اور نہ رہبانیت کا تسلط! "

ابلیس کیا ہے ——— ؟ ابلیس دراصل انسان کی انہی شریر قوتوں کا نام ہے جن کو قرآن نے " اسفل سافلین " کہا ہے، ان قوتوں سے انسان ہمیشہ جنگ کرتا رہتا ہے۔ اس کا سب سے بڑا شیطان اس کا نفس ہی ہے، جس کو قابو میں کر لینے سے اس میں بے اندازہ طاقت آجاتی ہے۔ پھر وہ پہاڑوں کو لوٹتا، عناصر کا منہ پھیرتا، اور ہر معرکہ میں کامیاب ہوتا ہے :-

" ان النفس لامارۃ بالسوء " (یوسف)

" درحقیقت نفس ہی برائی کا بہت بڑا حکم دینے والا ہے "

نتیجہ اس بحث کا یہ ہے کہ اقبال کا " انسان کامل " نیٹشے کے " فوق البشر " سے

بہت مختلف بلکہ اس سے بہت بلند ہے۔ نیٹشے کے سامنے اپنے تخیل کا کوئی عملی نمونہ
نہیں ہے۔ اس کا مستقبلِ بعید میں ظاہر ہونے والا "فوق البشر" خدا کا منکر ہے "شخصی
اقتدار کا دیوتا ہے" اور آقا و غلام کے فلسفہ کو باقی رکھنے والا ہے۔ وہ غریبوں کے
حسیات و مصائب کو نہ سمجھ سکتا ہے، نہ ان کا ازالہ کر سکتا ہے کیونکہ وہ صرف طبقہ اعلیٰ
سے ہے اور طبقہ ادنیٰ کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ صرف مادیت کا معمار ہوگا
اور روحانی تربیت کے لئے اس کے پاس کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔ برخلاف اس کے
اقبال کے سامنے اس کی تخیل کا مکمل ترین نمونہ رسول اللہؐ کی ذات ہے، اس کا
"انسان کامل" صاحبِ ایمان اور جمہوریت و مساوات کا بانی ہے۔ اس کی نظر میں
آقا و غلام سب برابر ہیں۔ اور انسانی فضیلت کا معیار اس کی نظر میں صرف
تقویٰ و طہارت پر ہے۔ وہ بحیثیت انسان اور ابن آدم کے کسی سے نفرت
نہیں کرتا اور ہر ایک کے حسیات و جذبات کو خوب سمجھتا ہے اس کا عمل روحانیت
و مادیت کے امتزاج کا مظہر ہے۔ وہ ہر وقت اور ہر زمانہ میں اور ہر طبقہ میں سے
ظاہر ہو سکتا ہے۔ اور اپنی بے پناہ قوتوں سے ہر مرض کا ازالہ کر سکتا ہے۔ اور
کوئی رکاوٹ اس کی سدِ راہ نہیں ہو سکتی ——

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
"نگاہِ مردِ مومن" سے بدل جاتی ہیں تقدیریں!

(بانگ درا)

———

موت وحیات

خوگرِ پرواز کو، پرواز کا ڈر کچھ نہیں

موت اِس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں

(بالِ جبریل)

مشرق کے سازِ حیات میں، زندگی کا حقیقی سوز مدت سے سویا ہوا تھا
اقبال مئے حیات سے سرشار ہو کر کائنات کا رباب اُٹھا لیتا ہے۔ اور اس کے
خاموش تاروں پر مضرابِ خودی اِس زور سے لگاتا ہے کہ اس کی آواز بازگشت
سے آسمان و زمین گونج اُٹھتے ہیں۔ ہر ذرّہ بیدار ہو کر وجد میں آجاتا ہے۔
ہر شئے میں زندگی رقص کرنے لگتی ہے۔ اور ہر گوشہ سے یہ حیات افروز
نغمہ سپوشت نکلتا ہے ــــــــ

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیمِ جاں ہے زندگی
تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی
زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگِ گراں ہے زندگی
بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

(بانگِ درا)

پیغمبرِ حیات کے اس نغمۂ زندگی پر انسانیت وجد کرتی ہے۔ وہ زندگی کو اصل حقیقت جانتا ہے اور آدم کو خلاصۂ کائنات سمجھتا ہے۔ میلادِ آدم پر جب اس کی نظر پڑتی ہے تو وہ یورپ کے مشہور مفکر ڈارون کی طرح پستی و تاریکی کے گہرے غاروں میں گر کر صرف حیوانیت کی دلدل میں نہیں پھنس جاتا۔ بلکہ آدم کی پیدائش میں حقیقتِ کبریٰ کا ظہور، جذب و تسخیر کی پیدائش اور جلالِ ربانی کا طلوع دیکھتا ہے۔ جس کی گرہ کشائی و باریک بینی پر عشق فخر کی گردن بلند کرتا ہے اور حسن خوف آمیز شوق سے مسکرا کر ناز سے انگڑائیاں لینے لگتا ہے:

نعرہ زد عشق کہ خونیں جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد

خبرے رفت ز گردوں بہ شبستانِ ازل
حذر اے پردگیاں پردہ دری پیدا شد!

(پیام مشرق)

جب آدم فتح و نصرت کا ڈنکا بجانے اور اپنی قوتوں کو آزمانے کے لئے جنت کو خیرباد کہتا ہے، تو فرشتے اور حوریں اس فاتح کائنات پر مسرت و عقیدت کے پھول نچھاور کرتی ہیں اور مبارک باد کے نغمے گا گا کر رخصت کرتی ہیں:۔

عطا ہوئی ہے تجھے روز و شب کی بیتابی
خبر نہیں کہ تو خاکی ہے یا کہ سیمابی
سنا ہے خاک سے تیری نمود ہے لیکن
تری سرشت میں ہے کوکبی و مہتابی!
جمال اپنا اگر خواب میں بھی تو دیکھے
ہزار ہوش سے بہتر تری شکر خوابی
تری نوا سے ہے بے پردہ زندگی کا ضمیر
کہ تیرے ساز کی فطرت نے کی ہے مضرابی

(بالِ جبریل)

جنت سے رخصت ہو کر آدم رزمگاہِ حیات میں یقینِ محکم، جہدِ پیہم اور عشق جگر سوز و جنون انگیز کے ہتھیار لے کر آتا ہے:۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں یہ ہیں مردوں کی شمشیریں

ورودِ آدم پر روحِ زمین اس کے قدم چومتی اور نیاز و عقیدت اور مسرت کے جذبات کے ساتھ اس کے حضور میں سپاس گزار ہوتے ہوئے اپنے تمام

خزانوں کی کنجیاں اس کے آگے ڈال دیتی ہے :۔

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ!
مشرق سے نکلتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ!

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں
یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں
تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ!

سمجھے گا زمانہ تری آنکھوں کے اشارے
دیکھیں گے تجھے دور سے گردوں کے ستارے

ناپید ترے بحرِ تخیل کے کنارے
پہنچیں گے فلک تک تری آہوں کے شرارے

تعمیرِ خودی کر، اثرِ آہِ رسا دیکھ!

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

(بالِ جبریل)

آدم زندگی کے کیف و سرور سے جھوم جھوم کر یہ نغمہ گاتا ہے :۔

چہ خوش است زندگی را ہمہ سوز و ساز کردن
دل کوہ و دشت و صحرا بہ دمے گداز کردن
ز قفس در کشادن بہ فضائے گلستانے
رہ آسمان نوردن، بہ ستارہ راز کردن
بگداز ہائے پنہاں بہ نیاز ہائے پیدا
نظرے ادا شناسے بحریم ناز کردن
ہمہ روز نا تمامم، ہمہ درد آرزویم
بگماں و ہم یقین را کہ شہید جستجویم

(پیام مشرق)

لیکن اقبال اس شاندار ابتداء کو بھی لائق اعتنا نہیں سمجھتا، وہ آئینہ امروز میں حقیقت فردا دیکھتا ہے، اس کے قدم آگے ہی بڑھتے رہتے ہیں، اور نظر ہر وقت انتہا پر جمی رہتی ہے۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں میری انتہا کیا ہے!

(بال جبریل)

اور وہ انتہا یہ ہے کہ انسان خدا کے سامنے بھی نہایت خود دارانہ اپنی صنعت کو رکھتا ہے اور فخریہ کہتا ہے:۔

تو شب آفریدی، چراغ آفریدم
سفال آفریدی، ایاغ آفریدم

بیابان و کہسار و راغ آفریدی
خیابان و گلزار و باغ آفریدم
من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم
من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

(پیامِ مشرق)

عالمِ آب و گل کی تسخیر و تعمیر سے فارغ ہو کر آسمان کی طرف نظر کرتا ہے
اور اس سقفِ کہنہ میں چھید کرتے ہوئے کہتا ہے :-

نگاہِ بے ادب زد رخنہ ہا در چرخِ مینائی
دِگر عالم بنا کن گر حجابے درمیان خواہی

(زبورِ عجم)

کیونکہ آسمان تو اس کی پرانی جولانگاہ ہے

سبق ملا ہے یہ معراجِ مصطفیٰ سے مجھے
کہ عالمِ بشریت کی زد میں ہے گردوں

(بالِ جبریل)

انسان کا آخری مقام یہ بھی نہیں ہے اس کی خلشِ جستجو اور فطرت
سیمابی بحر و بر اور آسمان و زمین سب کھنگال ڈالتی ہے اس کی بیقراری جنون اور
بیتابیِ حیاتِ خالقِ کائنات سے ہر آن ایک نیا میدان طلب کرتی ہے اور اس کی
ذوقِ فتح کا سیلاب ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری رزمگاہ تلاش
کرتا رہتا ہے۔ ؎

شایانِ جنونِ ما پہنائے دو گیتی نیست
ایں راہگذر ما را آں راہگذر ما را
ایں شیشۂ گردوں را از بادہ تہی کردیم
کم کاسہ مشو ساقی مینائے دِگر ما را

(زبورِ عجم)

طرح نو افگن کہ ما جدّت پسند افتادہ ایم
ایں چہ حیرت خانۂ امروز و فردا ساختی

(پیامِ مشرق)

کیونکہ زندگی نام ہے خلشِ عشق کا، اور عاشق کی تعریف ہی یہ ہے کہ وہ کسی مقام میں الجھ کر نہیں رہ جاتا، وہ ہر مشکل پر فتح پاتا ہوا، ہر وادی کو چھانتا ہوا آگے ہی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اس کا مقام آسمانوں سے بہت پرے ہے۔ آدم کائنات میں نہیں سماتا، بلکہ کائنات اس میں سما جاتی ہے۔ اور وہ عالم کے لئے نہیں، بلکہ عالم اس کے لئے بنے ہیں:-

درد و عالم ہر کجا آثارِ عشق
ابنِ آدم سرے از اسرارِ عشق
حرفِ "اِنّی جاعلٌ" تقدیرِ او
از زمیں تا آسماں تفسیرِ او
آنچہ در آدم بگنجد عالم است
آنچہ در عالم نگنجد آدم است

برتر از گردون مقامِ آدم است
اصلِ تہذیب احترامِ آدم است

(جاوید نامہ)

زندگی کا مسافر جب ذوقِ سفر سے آشنا ہو جاتا ہے تو وہ پھر اپنی کمر کسی جگہ نہیں کھولتا۔ زندگی کی لذت اس کو سوزِ ناتمامی و راہ پیمائی میں ہی ملتی ہے۔

تپیدن و نرسیدن چہ عالمے دارد
خوشا کسے کہ بدنبالِ محمل است ہنوز

(زبورِ عجم)

جنت کی دلفریبیاں اور حوروں کی عشوہ طرازیاں بھی اس کو روک کر پابندِ مقام نہیں کر سکیں، وہ ہر پھول کی خوشبو سونگھتا، ہر چشمے کا پانی پیتا، اور ہر دلچسپ منظر پر نگاہیں ڈالتا قدم آگے ہی بڑھائے چلا جاتا ہے۔ راستے کے گڑھوں کو ہموار کرتا، چٹیل میدانوں میں آبِ شیریں کے چشمے بہاتا، اور جنگلوں کو گلزار بناتا بڑھتا جاتا ہے۔ ایک دور کا نصب العین اس کے سامنے ہوتا ہے، وہ جتنا اس کے قریب پہنچتا ہے اتنا ہی وہ اس سے دور ہو کر اس کے ذوقِ سفر کو تیز کرتا رہتا ہے وہ اس راز سے بخوبی آشنا ہوتا ہے کہ جمود و تعطل، اور قیام و آرام موت کا پیش خیمہ ہے۔ اس کا تمام سکون، اور اس کی تمام راحت اس کی مسلسل حرکت اور پیہم سوز میں ہے۔ اور اس کی منزل قطعِ مراحل ہی میں ملتی ہے۔ وہ جب تک چل رہا ہے، مر نہیں سکتا، وہ مر کر بھی زندہ رہتا ہے اور اس کی خاک سے ہزاروں زندگیاں پیدا ہوتی ہیں:۔

ز جوئے آسماں بگذر زنیلِ کہکشاں بگذر
ز منزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے!

(زبورِ عجم)

وہ اس لئے نہیں ہوتا کہ خود کاٹ کر اپنا ہی پیٹ بھرے، وہ مکان اس لئے نہیں بناتا کہ ہمیشہ کے لئے اس کے اندر پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے۔ اور اس کی مختصر سی چاردیواری میں اپنی دنیا محدود کرے۔ اس کی تمام کاوش اور تمام محنت کمزوروں اور ضعیفوں کے استفادہ و آرام کے لئے ہوتی ہے وہ ایک شاہین ہے۔ جو کبوتر پر اس لئے نہیں جھپٹتا کہ اس کا خون چوس کر پیٹ کی آگ بجھالے۔ بلکہ اس کے نزدیک زندگی کا لطف ہی یہ ہے کہ ہمیشہ جھپٹ کر پلٹتا رہے۔ اور پلٹ کر جھپٹتا رہے۔ لامحدود فضا میں پرواز اور خیابانوں سے دور کہساروں کی سخت کوشی ہی اسکی زندگی کی محافظ اور شباب کی ضامن ہے۔ ے

حمام و کبوتر کا بھوکا نہیں میں
کہ ہے زندگی بازکی زاہدانہ
جھپٹنا پلٹنا، پلٹ کر جھپٹنا
لہو گرم رکھنے کا ہے اک بہانہ

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں
جو کبوتر پر جھپٹنے میں مزا ہے اے پسر
وہ مزا شاید کبوتر کے لہو میں بھی نہیں!

(بالِ جبریل)

وہ "اگر خواہی سلامت برکنار است" ــــــ کی بے روح و نمناک تعلیم کا استہزا کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہے، جس کی روانی کبھی نہیں رکتی۔ اور جس کی موج اسی وقت تک موج کہلاتی ہے کہ وہ ابھرتی رہے چلتی رہے، اور ساحل کی چٹانوں سے پر شور طریقہ پر ٹکراتی رہے۔ جو حوادث کے گرداب اور مصائب کے تھپیڑوں کے خوف سے اپنی کشتی دریا میں نہیں ڈال سکے گوہر حیات نہیں ملتا۔ اس لئے زندگی کا مسافر ہمیشہ موجوں سے لڑتا اور گرداب کو چیر کر مسرور ہوتا ہے۔ اور مخالف قوتوں سے ستیزہ کاری و نبرد آزمائی کو ہی عین حیات جانتا ہے:۔

میا را بزم بر ساحل کہ آنجا
ہوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش در آویز
حیاتِ جاوداں اندر ستیز است!

(پیام مشرق)

زندگی کے اس جذب و مستی کو فخریہ فرشتوں کی تن آسانی و ہمواری کے سامنے رکھتا ہے، کہ خطرات و مصائب کو دعوتِ مقابلہ دے کر شاد ہونا عرشیوں کا مقام نہیں ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ!

(بالِ جبریل)

زمانہ کے مخالف جھونکوں کے ساتھ پلٹ جانا وہ اپنی خداداد صلاحیتوں

اور قوتوں کی توہین سمجھتا ہے، وہ گھاس کا تنکا بننا نہیں چاہتا جس کو ہوا اڑا کر لیجائے بلکہ وہ منجمد پہاڑ بننا پسند کرتا ہے جس سے ٹکرا کر ہوا کی چیخیں نکل جائیں۔ اور اس سے بھی زیادہ کوئی اور عظیم قوت ہے جو زمانہ کو فتح کر کے اپنے حکم کے مطابق چلاتی ہے اگر زمانہ اس کے مصالح کے خلاف جاتا ہے تو وہ زمانہ کے اجزا بکھیر دیتا ہے۔ اور ان کو پھر سے ایک نئی ترکیب دیکر اس کی گردش کے خطوط اپنے ارادوں کے مرکز کے ارد گرد قائم کرتا ہے:۔

کہتا ہے زمانہ سے یہ درویش جوانمرد
جاتا ہے جدھر بندۂ حق تو بھی ادھر جا
ہنگامے ہیں میرے تری طاقت سے زیادہ
بچتا ہوا بنگاہِ قلندر سے گزر جا
میں کشتی و ملاح کا محتاج نہ ہونگا
چڑھتا ہوا دریا ہے اگر تو تو اتر جا
مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر!
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر!

(ضرب کلیم)

کیونکہ اس کا یقین وخود اعتمادی اور عشق وجنون اس کو وہ سربلندی عطا کرتا ہے، کہ تقدیر الٰہی اس کے ارادوں میں شامل رہتی ہے وہ تقدیر کا محکوم نہیں رہتا، بلکہ تقدیر اس کی نگاہوں کی گردش کو دیکھتی رہتی ہے۔

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندہ سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے؟

(بال جبریل)

عشق یقین کے قدموں سے روندے ہوئے خوف و شک اور یاس و نامرادی اس کے پیچھے دم توڑتی رہتی ہے، اس کی فتوحات عقل پر نہیں عرفان و وجدان پر ہوتی ہیں۔ نظر اس کے دل کی تابع اور فکر اس کے جنون کے ماتحت رہتی ہے۔ وہ ہر خطرناک گھاٹی کو نڈر دل کے ساتھ پھلانگ جاتا اور ہر نئے مقام میں مجرمانہ انداز پر قدم رکھتا ہے:۔

بگذر از عقل و در آویز بہ موج یم عشق

کہ دراں جوئے تنک مایہ گہر پیدا نیست

(پیام مشرق)

وہ اپنے زمانہ کا فاتح ہوتا ہے، اور دنیا کے تمام ناتوانوں اور گم کردہ راہوں کو آواز دیتا ہے، کہ —— آؤ! اگر تمہارے سینوں کی حرارت بالکل ٹھنڈی نہیں ہو گئی ہے۔ اور اگر تمہاری رگوں میں خون کا ایک قطرہ بھی باقی ہے تو میرے پاس آؤ! تمہاری تمام بیچارگیوں اور تمام حیرانیوں کا علاج میرے پاس ہے۔ تم نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی زمین چیر کر اور آسمان پھاڑ کر غذا نکال سکتے ہو۔ اور تمہاری خاک ہمدوشِ ثریا بن سکتی ہے:۔

اگر یک قطرہ خوں داری اگر مشت پرے داری

بیا من با تو آموزم طریق شاہبازی را!

(زبور عجم)

تو در زیر درختاں ہمچو طفلاں آشیاں بینی
بہ پرواز آکہ صید مہر و ماہے می تواں کردی

(زبور عجم)

اور صحیفۂ حیات کی ان الفاظ میں تفسیر کرتا ہوا وہ علاج بتاتا ہے :-

پرسیدم از بلند نگاہے حیات چیست
گفتا مئے کہ تلخ تر او نکو تر است؛

گفتم کہ کرمک است و زگل سر بروں زند
گفتا کہ شعلہ زاد مثال سمند راست

گفتم کہ شر فطرت خامش نہادہ اند
گفتا کہ خیر او نشناسی ہمیں شر است

گفتم کہ شوق سیر نبردش بمنزلے
گفتا کہ منزلش بہ ہمیں شوق سفر است

گفتم کہ خاکی است و بخاکش ہمی دہند
گفتا کہ دانۂ خاک شگافد گل تر است

(پیام مشرق)

وہ ایسی سکون آئین بہشت میں ایک لمحہ نہیں ٹھیر سکتا جہاں تابندگیٔ زیست کے لئے فطرت کے مثبت و منفی دونوں تار نہوں اور پختگیٔ ذوقِ حیات کے لئے حوادث کی ستیزہ کاری نہو۔ جس کے دریاؤں میں طوفان نہ اٹھتے ہوں اور جس کی کشتیاں موج گرداب کے خطرات سے مامون ہوں جہاں کا قرب جاوید ہجر کے سوز اور وصل کی لذت سے محروم کر دے۔

وہ جہاں اور بہشت بہت ہی کور ذوق اور مسافرانِ حیات کے لئے ناقابلِ التفات ہے، جہاں صرف یزداں کی ہی جلوہ فروشی ہو اور اہرمن کے ہنگامے نہ اٹھتے ہوں۔ ؎

کجا ایں روزگارے شیشہ بازے
بہشت ایں گنبدِ گرداں ندارد

ندیدہ دردِ زنداں یوسفِ او
زلیخائش دلِ نالاں ندارد

خلیلِ او حریفِ آتشے نیست
کلیمش یک شرر در جاں ندارد

بہ صرصر در نیفتد زورقِ او
خطر از لطمۂ طوفاں ندارد

کجا آں لذتِ عقلِ غلط سیر
اگر منزل رہِ پیچاں ندارد

مزی اندر جہانِ کور ذوقے
کہ یزداں دارد و شیطاں ندارد

(پیامِ مشرق)

یہی وہ بے روح اور سنسان جنت ہے جس سے غالب نے بھی پناہ مانگی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ غالب کی مثنوی "ابرِ گہر بار" میں سے بھی چند اشعار نقل کر دیئے جائیں، جہاں اس نے بہشت کی کور ذوقی و ویرانی کا نقشہ کھینچتے ہوئے نہایت حسرت آگیں انداز میں خدا سے شکایت کی ہے کہتا ہے کہ جب دنیا کی محرومیوں اور دلچسپیوں کی لذتِ کشمکش یاد آجاتی ہے

تو باغِ جنت کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اگر شرابِ طہور پی بھی لوں، تو اس میں وہ لذت
کہاں جو دنیا میں بتاشیری صبح کو جامِ بلوریں سے پینے میں ملتی تھی۔ پھر اس
پاک و مقدس میخانہ کی جلال برساتی ہوئی خاموش و پر سکوت فضاؤں وہ ہنگامہ
نوشانوش و شورِ مستانہ اور شب کی مستیاں اور کیف باریاں کہاں مل سکتی ہیں
جو صرف دنیا کا حصہ ہیں۔ اور ہائے وہ ساون بھادوں کی جھڑیاں اور مست
خرام گھٹائیں بھی تو نہیں دکھتیں۔ یہ ایک سدا بہار گلشن ضرور ہے۔ مگر جب تک
خزاں نہ ہو تو بہار کا لطف معلوم۔ رہیں حوریں۔ تو یہ وہ بے حس مورتیاں ہیں جن کے
سینوں کا تار چڑھاؤ جذبات سے بالکل خالی ہے۔ کیا ایسے وصل کو بھی وصل کہا
جا سکتا ہے، جس میں خلشِ ہجر اور لطفِ انتظار نہ ہو؟ ——— آہ ایسے
کور ذوق و فرمانبردار محبوب سے دلِ شوریدہ کی کیا تسکین ہو سکتی ہے، جو کسی
التجا کو نازِ معشوقانہ سے ٹھکرانا نہیں جانتا۔ اور طلبِ بوسہ پر ذرا ترش رو
نہیں ہو جاتا ——— حور تو بس حکم کی بندی ہے! اور محبوبیت کی اس میں
کوئی ادا نہیں۔ وہ نہ تو جھوٹی قسموں سے فریب دینا جانتی ہے، اور نہ لبوں
سے کبھی تلخ گفتاری کی شراب ٹپکاتی ہے، اس کے بوسے پھیکے اور اس کا
وصل بے کیف ہے فردوس کی دیواروں میں کوئی ایسا جھروکہ بھی نہیں ہے، جو
نظربازی و ذوقِ دیدار کو آسودہ کرے۔ نہ یہاں پیغام و سلام کا لطف ہے،
نہ قاصد کا انتظار، نہ دل کسی ناکامی پر تڑپتا ہے اور نہ کسی شوخ و شنگ معشوقہ
کی یاد چٹکیاں لیتی ہے۔ بھلا ایسی جنت میں کیا تسکین بخش سکتی ہے۔

چو آں نامرادیہا بیاد آیدم
بفردوس ہم دل نیاسایدم

صبوحی گرم خوردم شراب طہور
کجا زہرہ صبح و جام بلور
دم شیر دیہاتے مستانہ کو
ہنگامہ غوغائے مستانہ کو
دراں پاک میخانہ بے خروش
چہ گنجائش شورش ناؤ نوش
سیہ مستیٔ ابر باراں کجا
خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور در دل خیالش کہ چہ
غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناساں نگار
چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دم بوسہ انیشں کجا
فریبد بہ سوگند و بینش کجا
نظر بازی و ذوقِ دیدار کو
بفردوس روزن بہ دیوار کو
نہ چشم آرزو مند و لالہ
نہ دل تشنہ راہ پرکالہ

اقبال کی کارگاہِ حیات میں موت ایک بے معنیٰ لفظ ہے۔ موت

وہی ڈرتے ہیں اور موت انھیں کو آتی ہے، جو خود شناس نہیں۔ اور جن کا جینا صرف اپنے لئے ہے۔ مردانِ حق کے واسطے شہرتِ عام و بقائے دوام کا خلعتِ حیات و ممات ہی کے تار پود سے طیار رہتا ہے۔ ان کا عشق و یقین موت کا مضحکہ اڑاتا ہے، اور ان کا جنون موت کو کھیل سمجھتا ہے حقیقی زندگی کا آغاز موت ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کی خلش جستجو کو موت کی تاریکی میں بھی کیفِ حقائق کی روشنی نظر آتی ہے۔

اقبال کی نگاہِ بصیرت قدرت کی قوتِ تخلیق کو بے نقاب دیکھتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ یہاں موت تو ہے ہی نہیں۔ جو کچھ ہے سب زندگی ہی زندگی ہے ازل سے ابد تک صرف زندگی راہِ حیات کے ہی بے شمار پیچ و خم اور لاتعداد گھاٹیوں میں سے ایک گھاٹی کا نام موت ہے۔ موت مذاقِ زندگی کی تجدید ہے۔ اس میں خوف انھیں کے لئے ہے، جنھوں نے موجودہ زندگی کو نہیں سمجھا اور نہیں سنوارا۔ یہی وہ لوگ ہیں، جو زندہ رہنے کے لئے نہیں مرتے، بلکہ مرنے کے لئے زندہ رہتے ہیں۔ موجودات کی ہر پستی و بلندی میں، ہر آزادی و قید میں اور ہر حیات و نزع میں بجز زندگی کے کچھ نہیں۔ زندگی کی ندی میں ہزاروں پیچ و خم ہیں۔ وہ کہیں ابھرتی ہے، کہیں دبتی ہے، کہیں گاتی ہے، کہیں شور مچاتی ہے، کہیں دوڑتی ہے، کہیں ساکن ہو جاتی ہے۔ کہیں وحدت میں تجلی ریز ہے، کہیں کثرت میں جلوہ آرا۔ تڑپنے پھڑکنے میں اس کو لذت ملتی ہے۔ جس جگہ کچھ دیر کے لئے ساکن ہو جاتی ہے، اس کو لوگ ———— موت کہتے ہیں:—

رواں دم رواں ہے یم زندگی

ہر اک شے سے پیدا رم زندگی

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور
ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوقِ پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھکر پسند
اُلجھ کر سلجھنے میں لذت اسے
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے

سمجھتے ہیں ناداں اسے بے ثبات
اُبھرتا ہے مٹ مٹ کے نقشِ حیات

بڑی تیز جولاں بڑی زود رس
ازل سے ابد تک رمِ یک نفس

(بالِ جبریل)

زندگی ایک تلوار ہے اور خودی ـــــ تلوار کی دھار۔ زندگی کے جوشِ نمو کے بطون کا نام خودی ہے۔ اور یہ وہ نوا ہے جو زندگی کو تابناک بناتا اور اس کو دماغ عطا کرتا ہے ؎

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات
خودی کیا ہے بیدارئ کائنات

خودی جلوہ مست و خلوت پسند
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند

اندھیرے اجالے میں ہے تابناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک

زمانہ کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی

تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی

سبک اس کے ہاتھوں میں سنگِ گراں
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگِ رواں
سفر اس کا انجام و آغاز ہے
یہی اس کی تقویم کا راز ہے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی جسم خاکی میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے

(بالِ جبریل)

پیدائش کی گرم بازاری دیکھو تو موت کا تصور ایک مضحکہ خیز واہمہ سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ہر موت ہزاروں زندگیوں کی تخلیق کرتی ہے۔ ایک درخت میں ہر سال سینکڑوں پھل آتے ہیں۔ ہر پھل میں لاتعداد بیج ہوتے ہیں۔ اور ہر بیج اپنے مختصر سے وجود میں پورا عظیم الشان درخت ہوتا ہے جو زمین میں گل سڑ کر نکلتا ہے، اور اسی طرح ہزاروں درختوں کی تخلیق کرتا ہے:-

" فانظر الیٰ آثارِ رحمت اللہ کیف یحی الارض بعد موتھا ان ذالک لمحی الموتیٰ وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر۔

(روم ۵)

" اللہ کی ان نشانیوں کو دیکھو کہ اس نے زمین کو کس طرح

از سرِ نو زندگی بخشی، جبکہ وہ مر چکی تھی۔ بیشک وہ ہر موت کو حیات سے بدلنے والا اور سب کچھ قدرت والا ہے"

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے
موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات
عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
خام فکری سے شفق خونِ سحر سمجھی گئی
صبح شبنم سے بیاضِ چشمِ تر سمجھی گئی
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہیئتِ تعمیر پر
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوتِ تعمیر پر
موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے
خوگرِ پرواز کو پرواز کا ڈر کچھ نہیں
موت اس گلشن میں جز سنجیدنِ پر کچھ نہیں

(بالِ جبریل)

جوہرِ انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

(بانگِ درا)

اقبال نے ہمارے سامنے وہ خنجر ڈال دیا ہے جس سے ہم موت کے اس سیاہ پردے کو چیر سکتے ہیں۔ اور اس ذوق و مستی سے خبردار کر دیا ہے جس سے ہم اس ان دیکھی اور بن بوجھی دنیا کے اسرار معلوم کرنے کے لئے مردانہ وار اور بے جھجک قدم بڑھا سکتے ہیں۔

جب کوئی شخص ایک پاک اور بلند نصب العین پر نظر رکھ کر جدوجہد کرتے ہوئے جان دیتا ہے تو اقبال بجائے نالہ و ماتم کے فخر کا اظہار کرتا اور مسرت سے جھومنے لگتا ہے۔ کیونکہ ایسی ہی موت سے حیات کی مشعل میں تیل پڑتا ہے، اور وہ اور زیادہ روشن ہو جاتی ہے:۔

"ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ

امواتا بل احیاءٌ ولٰکن لا تشعرون (بقر)

"جن لوگوں نے مقصدِ حیات کو پورا کرتے ہوئے
خدا کی راہ میں جانیں دی ہیں کیا تم ان کو مردہ سمجھتے ہو؟
ان کو مرا ہوا مت جانو، وہ مرے نہیں بلکہ درحقیقت
زندہ وہی ہیں، لیکن ان کی تابندگیٔ حیات کو بے عمل
و بے بصر آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔"

چنانچہ جنگ طرابلس میں جب ایک لڑکی غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے جام شہادت نوش کرتی ہے، تو اقبال اس کی موت کو سعادت و نیک بختی سے تعبیر کرتا اور اس کے جسم کی چادر کو خون سے لالہ زار دیکھ کر اس کی روح وجد میں آجاتی ہے، اور سینہ سے بے اختیار یہ کیف بار نغمہ چھوٹ نکلتا ہے:۔

فاطمہ! تو آبروئے ملت مرحوم ہے
ذرہ ذرہ تیری مشت خاک کا معصوم ہے
یہ سعادت حور صحرائی تری قسمت میں تھی
غازیان دین کی سقائی تری قسمت میں تھی
یہ جہاد اللہ کے رستہ میں بے تیغ و سپر
ہے جسارت آفریں شوق شہادت کس قدر

پھر فراوانی جذبات سے سینہ تان کر مسکراتی ہوئی نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور فخریہ کہتا ہے :۔

یہ کلی بھی اس گلستان خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنے خاکستر میں تھی
اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اس جانبازانہ و مجاہدانہ موت میں اس کو زندگی کا سوز ملتا ہے، وہ اس خاک کے ذرّوں سے حیات کے بے شمار سوتے اُبلتے ہوئے دیکھتا ہے اور بیخود ہو جاتا ہے۔ کیونکہ "جب تک ہم میں ایسی مجاہد ہستیاں موجود ہیں۔ اور جب تک ہماری موتیں جانبازی و قربانی کی بے خوف و نڈر موتیں ہیں۔ اس وقت تک ہم کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں مٹا سکتی ——— مسلمان موت سے نہیں ڈرتا، وہ عزم و یقین کا مالک ہوتا ہے اور موت کے دھارے کو کاٹ کر حیات جاوید کے ساحل تک پہنچتا ہے ——— بزدلی سینکڑوں مرتبہ مرتی ہے، اور مر مر کر جیتی ہے، لیکن اولوالعزمی صرف ایک مرتبہ مرتی ہے اور مر کر زندہ تر ہو جاتی ہے، اس کے خون کا ہر چھینٹا سینکڑوں زندگیوں کی آبیاری کرتا ہے،

اور اس کی خاموشی لاتعداد ہنگاموں کا صور پھونکتی ہے"۔۔۔۔۔۔ ۵

فاطمہ! گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے
نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے
رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے
ہے کوئی ہنگامہ تیری تربت خاموش میں
پل رہی ہے ایک قوم تازہ اس آغوش میں!

(بانگ درا)

خودی

بخود خزیدہ و محکم چو کوہساراں زی
چوں خس مزی کہ ہوا تیز و شعلہ بیباک است

(پیام مشرق)

حیات انسانی کے لئے پیغمبر حیات کا یہ خاص پیغام ہے، جو اس نے برسوں کی محنت و کاوش فکر کے بعد نہایت جامع و کمل طریقہ پر اپنے مخصوص انداز میں "اسرار خودی" و "رموز بیخودی" کے نام سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اور مثنوی اسرار و رموز کے علاوہ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ سب اسی کی پر لطف تکرار و توضیح ہے۔

خودی کیا ہے ——— ؟ مختصر طور پر اس کی تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ

تمام پیش آمدہ مشکلات پر غالب آکر اور رکاوٹوں کو دور کر کے اُبھرنے اور جذب و تسخیر کی قوت پیدا کرنے کا نام خودی ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہ ——— معرفتِ ہستی کا دوسرا نام ہے۔ یعنی جس طرح ہم قدرت کے مادی مظاہر کو باہم فرق و تمیز کرتے اور سمجھتے ہیں کہ یہ پیتل ہے، یہ سونا ہے یہ آگ ہے، یہ پانی! ——— اسی طرح ہمیں اپنے وجودِ معنوی کو دیکھنا اور سمجھنا چاہیئے۔ پہلے اپنی ہستی پر نظر ڈالنا چاہیئے بعد میں دوسری اشیا پر کہ حقیقی بصیرت اسی سے حاصل ہوتی ہے۔ وہ دل مردہ اور آنکھیں اندھی ہیں جو اپنے آپ کو دیکھے بغیر کائنات کو دیکھتیں اور اس کے معرفت بطون کا دعوی کرتی ہیں۔: ؎

" و فی الارض آیات للموقنین

و فی انفسکم افلا تبصرون "

(والذاریات)

" آسمان و زمین میں ہدایت پانے والوں اور بصیرت رکھنے والوں کے لئے، ہماری نشانیاں ہیں۔ لیکن یہ نشانیاں خود تمہارے نفس میں بھی بہت کچھ ہیں کیا تم ان کو دیکھتے نہیں ———؟ "

بینی جہاں را خود را نہ بینی

تا چند ناداں غافل نشینی

(زبورِ عجم)

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں ایسا الجھا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا

(ضرب کلیم)

دنیا کے اندر ہر مرد حق آگاہ نے پہلے اپنے نفس کو پہچانا ہے، اس کے بعد کائنات کے عقدے سلجھائے ہیں۔ اور منصب انسانیت و خلافت پر سریر آرا ہوا ہے۔ خود رسول اللہؐ کا اسوۂ حسنہ یہی رہا ہے آپؐ کی ایک مشہور حدیث ہے:۔

"مَن عرف نفسه فقد عرف ربهٗ"

"جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا، معرفت حق حاصل کر لی ــــــ"۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید
مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقش ما را در دل او ریختند
ملتے از خلوتش انگیختند!
می توانی منکر یزداں شدند
منکر از شان نبی نتواں شدند

گرچہ داری جانِ روشن چوں کلیم
ہست اِنکارِ تو بے خلوت عقیم
از کم آمیزی تخیّل زندہ تر
زندہ تر جوئندہ تر پائندہ تر

(جاوید نامہ)

زندگی اصل حقیقت ہے جس کی نمود خودی سے ہے۔ زندگی نام ہے ایک ایسی قوت کا جو مسلسل حرکت اور ترقی کرتی رہتی ہے، لیکن خود زندگی کو جو قوت متحرک رکھتی ہے اور ہستی کو عدم کی تاریکی سے نکال کر حیات کے اِرتقائی مدارج طے کراتی ہے، وہ خودی ہے، شجرِ حیات میں نمو اور تازگی اسی سرچشمہ سے آتی ہے۔ جس سے وہ بڑھکر پھل لاتا ہے، اور اس کے بیج سے دوسرے سینکڑوں درخت پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ خودی قدرت کی قوتِ تخلیق کی مظہرِ اتم ہے۔ یہ وہ نورِ خداوندی ہے، جو زندگی کو حالتِ جبر سے نکال کر مرتبۂ اِختیار پر فائز کرتی ہے۔ اور یہی وہ جوہرِ حیات ہے جس سے ہر شئے اپنی ہستی کو پہچانتی اور اپنی فطرت کو مستحکم کرتی ہے۔

کائنات کی رگ و پے میں خودی جاری و ساری ہے، اور زندگی کی تمام مختلف صورتیں خودی کے اِثبات کی دلیل اور اس کی قوتِ تغیر کی مظہر ہیں۔ لیکن خودی جب زندگی کے مختلف مدارج طے کرتی ہوئی ہستیٔ انسانی میں جلوہ گر ہوتی ہے تو اس وقت اس کے ظہور کا مکمل پہلو سامنے آجاتا ہے حیات کا یہی وہ مرکزی نقطہ ہے، جہاں سے خودی کے غلبہ و تسخیر کی تمام طاقتیں پوری پوری تکمیل و تنظیم کے ساتھ ظاہر ہوتی ہیں۔ کیونکہ خدا نے اِنسان کو تمام کائنات پر فضیلت بخشی ہے، اور سب کچھ اسی کی تسخیر و اِستفادہ کیلئے

پیدا کیا ہے:-

پیکرِ ہستی ز آثارِ خودی است
ہر چہ می بینی ز اسرارِ خودی است

خویشتن را چوں خودی بیدار کرد
آشکارا عالمِ پندار کرد

خامۂ او نقشِ صد امروز بست
تا بیارد صبحِ فردائے بدست

می شود از بہرِ اغراضِ عمل
عامل و معمول و اسباب و علل

خیزد، انگیزد، پرد، تابد، رمد
سوزد، افروزد، کشد، میرد، دمد

خود شکن گردید و اجزا آفرید
اندکے آشفت و صحرا آفرید

باز از آشفتگی بیزار شد
وز بہم پیوستگی کہسار شد

وانمودن خویش را خوئے خودی است
خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

(اسرار)

اقبال نے عالمِ محسوسات کی مثالیں دیکر اس کو سمجھایا ہے کہ کائنات کی ہر شئے سرمایہ دار خودی ہے اور جو چیز جتنی زیادہ اثباتِ خودی پر عامل ہے وہ اتنی ہی اپنی ہستی کو مستحکم کئے ہوئے قوتِ تسخیر کی مالک ہے۔ پانی کا قطرہ

جب اپنی خودی کو پہچان لیتا ہے تو موتی بن جاتا ہے، اور پہاڑ خودی کو فراموش کر کے صحرا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ زمین چاند سے زیادہ خودشناس و مستحکم ہے اس لئے چاند کو مسخر کئے ہوئے ہے۔ لیکن یہی زمین سورج کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس لئے سورج کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ غرض، زندگانی کا ہر سوتا جب خودی کی قوت حاصل کر لیتا ہے تو سمندر اور ذرّہ سے خورشید بن جاتا ہے:-

چون حیات عالم است از زورِ خودی است
پس بقدرِ استواری زندگی است

قطرہ چوں حرفِ خودی از بر کند
ہستیٔ بے مایہ را گوہر کند

کوہ چوں از خود رود صحرا شود
شکوہ سنجِ جوششِ دریا شود

چوں زمیں بر ہستیٔ خود محکم است
ماہ پابندِ طوافِ پیہم است

ہستیٔ مہر از زمین محکم تر است
پس زمین مسحورِ چشمِ خاور است

چوں خودی آرد بہم نیروئے زیست
می کشاید قلزمے از جوئے زیست

اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی انفرادیت کے استحکام کا زبردست اور بنیادی ذریعہ اثباتِ خودی ہے اس سے تسلسلِ حیات برقرار رہتا اور مادّی و روحانی ترقی و تسخیر کی راہیں کھلتی ہیں۔ لہٰذا انسان کے لئے اس جوہر بے بہا کو برقرار رکھنا ہی زندگی کے مترادف ہے اور اس کو ضائع کر دینا موت کے

ہم معنیٰ

۱۔ خودی تخلیقِ مقاصد سے زندہ رہتی ہے، لیکن زندگی کا مقصد اور نصب العین سہل الحصول اور پست نہیں ہونا چاہئیے۔ مقصد جس قدر بلند اور جتنا اونچا ہوگا، اسی قدر جوہرِ خودی میں تابش اور قوت آئے گی۔ کیونکہ نئے نئے اور پاکیزہ مقاصد مسلسل جدوجہد اور پیہم کوشش امنگوں اور آرزوؤں کو جگاتے ہیں اور امنگیں اور آرزوئیں ہی زندگی کی تعمیر میں مفید مسالے کا کام دیتی ہیں:-

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

اے زرازِ زندگی بیگانہ خیز
از شرابِ مقصدے مستانہ خیز

مقصدے از آسماں بالاترے
دلربائے، دلستانے، دلبرے

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم
از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

۲۔ جب تک بلند نصب العین پیشِ نظر رہتا ہے، اس وقت تک ہر لحظہ تڑپتی ہوئی تمنّائیں اور پھڑکتی ہوئی آرزوئیں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ جو جہدِ پیہم پر اکساتی ہیں۔ نوبنو امنگوں کی تخلیق زندگی کی ہر تلخی کو لطیف تبسم میں بدل دیتی ہے۔ آرزوؤں کی تڑپ عمل کو گرم رفتار رکھتی ہے، جس سے زندگی کے سمندر میں مد وجزر پیدا ہوتا ہے۔ اور قوتِ تسخیر بڑھتی ہے۔ دل میں امیدوں کی کروٹوں سے ہی رگوں میں گرم گرم خونِ حیات جوش مارتا رہتا ہے۔ اور یہ وہ حالت ہوتی ہے کہ اگر سامنے پہاڑ بھی آجائے تو مسکراتے ہوئے کاٹ ڈالا جاتا ہے۔

اسی لئے قرآن نے ہدایت کی ہے :-

"لا تقنطوا من رحمة الله"

"اللہ کی رحمت سے کسی حالت میں بھی امیدوں کا رشتہ نہ توڑ دو !"

گرم خوں انساں ز داغ آرزو
آتش ایں خاک از چراغ آرزو
از تمنائے بجام آمد حیات
گرم خیز و تیز گام آمد حیات
زندگی مضمون تسخیر است و بس
آرزو افسونِ تسخیر است و بس
زندگی صید افگن و دام آرزو
حسن را از عشق پیغام آرزو

برخلاف اس کے اگر بلند ترین نصب العین اور اعلیٰ مقاصد سامنے نہوں تو سینے کے اندر تمنائیں کروٹیں نہیں لیتیں، آرزوئیں نہیں مچلتیں اور جد و جہد کی حالتِ تسلسل میں فرق آجاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شخصیت فنا ہوجاتی ہے۔ زندگی کا بہتا ہوا دریا رک جاتا ہے، اور اس میں سے تعفن اُٹھنے لگتا ہے۔ اس صورت میں انسان کی زندگی مردوں سے بدتر ہوتی ہے اس کا سینہ اس کی مردہ روح کا مزار بن جاتا ہے۔ اور اس کا جسم ایک متحرک لاش سے زیادہ کوئی قیمت نہیں رکھتا۔ اس پر روحانی امراض کے علاوہ جسمانی امراض کا بھی حملہ ہوتا رہتا ہے، اور اس کی زندگی ایک بیکسی کی فریاد اور ناتوانی و مظلومیت کی فغاں بن جاتی ہے۔ وہ ہر قدم پر ٹھوکر کھاتا ہے۔ ہر کانٹے کی چبھن

اس کے لئے تلوار کا گھاؤ اور راستہ کا ہر روڑا اس کو پہاڑ معلوم ہوتا ہے :-

زندگی در جستجو پوشیدہ است
اصل او در آرزو پوشیدہ است

آرزو را در دلِ خود زندہ دار
تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

چون ز تخلیقِ تمنا باز ماند
شہپرش بشکست و از پرواز ماند

آرزو کا چشمہ سوکھتے ہی زندگی نہایت تلخ و دشوار گزار بن جاتی ہے دنیا اس کی نظر میں ایک سنسان و ہلاکت خیز ریگستان و سراب دکھائی دیتی ہے مقابلے و دفاع کی تمام طاقتیں فنا ہو جاتی ہیں ۔ یاس و نامرادی کی یہی وہ حالت ہے جو اکثر خودکشی کا سبب بن جاتی ہے، کیونکہ زندگی، زندگی اسی وقت تک ہے جب تک امید و آرزو کی تولید نہیں رکتی :-

مرگ را ساماں ز قطعِ آرزو است
زندگانی محکم از لاتقنطو است

تا امید از آرزوئے پیہم است
نا امیدی زندگانی را سم است

زندگی را یاس خواب آور بود
این دلیلِ سستیٔ عنصر بود

از دمش سیرو نوائے زندگی
خشک گردد چشمہ ہائے زندگی

لہذا جو چیز امید کی کرنوں کو یاس کے بادلوں سے چھپا دے اور عمل کو

سنت و معطل کر دے، خواہ وہ عقل ہو یا علم کسی پہلو سے بھی قابل التفات نہیں ہو سکتی۔ عقل و شعور اور علوم و فنون سب کو مقصدِ ارتقاءِ حیات کے تابع رہنا چاہیئے۔ آرٹ کا مقصد آرٹ ہرگز نہیں، بلکہ سلطانِ حیات کی خدمت و چاکری ہے۔ پہلے عمل بعد میں علم ——— یہی زندگی کا مقصد ہے۔ علم ہمیشہ عمل کا دست پرور رہا ہے کیونکہ علوم و فنون انسان سے ہیں اور انسان کے لیے ہیں۔ انسان ان سے نہیں ہے، اور نہ ان کے لئے ہے۔ اگر یہ حیاتِ انسانی پر ضرب لگاتے اور خودی کو مجروح کرتے ہیں، تو ایسے دفاتر کو بلا تامل جلا دینا چاہیئے:-

زندگی سرمایہ دارِ آرزو است
عقل از زائیدگانِ بطنِ اوست
علم از سامانِ حفظِ زندگی است
علم از اسبابِ تقویمِ خودی است
علم و فن پیش خیزانِ حیات
علم و فن از خانہ زادانِ حیات

خودی کی معرفت و قیام کے بعد اس میں جس چیز سے پختگی آتی ہے وہ "عشق" ہے۔ عشق و مستی اور محبت و جنون کو اقبال نے جن وسیع معنیٰ میں استعمال کیا ہے، اس کی تشریح "شعر و حکمت" اور "فکر و نظر" کے عنوانوں میں آ چکی ہے۔ عشق سے شکوک مٹتے اور یقین پیدا ہوتا ہے۔ اس سے خودی کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں۔ اور اس میں بے اندازہ قوت آتی ہے:-

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است
زیرِ خاک ما شرارِ زندگی است

از محبت می شود پائندہ تر
زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر

فطرت او آتش اندوزد زعشق
عالم افروزی بیاموزد زعشق

در جہاں ہم صلح و ہم پیکار عشق
آبِ حیواں، تیغ جوہر دار عشق

از نگاہ عشق خارا شق بود
عشقِ حق آخر سراپا حق بود

اور حصولِ عشق کے لئے ایک مسلمان کے سامنے بہتر و مکمل مثال رسول اللہ ؐ کی ذات ہے۔ کیونکہ آپ ہر حیثیت سے انسان کامل تھے۔ اس لئے چاہیئے کہ آپ کے اسوۂ حیات کو پیش نظر رکھے، آپ کی تقلید و پیروی کو زندگی کا نصب العین بنائے، اور آپ سے محبت کرے۔ عشق حق کا اصلی ذریعہ عشقِ رسول ہے۔ آپ کے صحابۂ کرام حیات کے جن مدارج علیا پر فائز ہوئے اور مادی و روحانی جس قدر فتوحات حاصل کیں، وہ سب نتیجہ تھیں تقلید، یاد و عشق نبی کا ——— لہذا :-

کیمیا پیدا کن از مشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

دل زعشق او توانا می شود
خاک ہمدوشِ ثریا می شود

در دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ است
آبروئے ما ز نامِ مصطفیٰ است

عشق سے خودی میں طاقت آتی ہے اور اقبال طاقت کا پرستار ہے
اس کو جس شئی میں اس کی چنگاری ملتی ہے ٹھہر جاتا ہے اور اپنے سوز نفس سے
اس کو بھڑکاتا ہے کیونکہ قوت ہی کا نام زندگی ہے۔ اور قوت ہی سب کچھ ہے
بلکہ دنیا میں سب سے بڑی حقیقت و صداقت صرف قوت ہے۔ صداقت کے
لئے قوت لازم تر ہے۔ بغیر قوت کے صداقت مردہ ہے۔ اور نامقبول ہے
تا وقتیکہ اس کو قوت کے جھنڈے پر بلند نہ کیا جائے قوت ہی کی زبان سے
حق و باطل کی تمیز ہوتی ہے اگر حق کے مقابلہ میں باطل قوی ہے۔ تو وہی
سب سے بڑی حقیقت ہے اور سب سے روشن صداقت ہے۔ حقیقت تو
ہمیشہ سے ایک ہے، جس کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اگرچہ اس کا نام اور لائحہ عمل
وغیرہ بدلتا رہے۔ لیکن دنیا صرف اسی حقیقت کو پوجتی ہے جس کا نام "قوت"
ہے۔ قوت دلیل و حجت سے بے نیاز ہوتی ہے۔ اس کے لئے صرف دعویٰ کرنا
اور حکم دینا کافی ہے۔ ہر باطل قوت کا سہارا پاکر حق کا لباس پہن لیتا اور حق کا
بطلان کرتا ہے۔ قوت کی گرمیٔ نگاہ سے زہر تریاق ہو جاتا ہے اور شر اس کا اشارہ
پاکر خیر بن جاتا ہے:۔

زندگانی قوت پیداستے
اصل او از ذوق استیلاستے

با توانائی صداقت توام است
گر خود آگاہی ہمیں جام جم است

زندگی کشت است و حاصل قوت است
شرح رمز حق و باطل قوت است

مدعی گر مایہ دار قوت است
دعوئے او بے نیاز حجت است
باطل از قوت پذیرد شانِ حق
خویش را حق داند از بطلانِ حق
از کنِ او زہر کوثر می شود
خیر را گوید شرے، شر می شود

جس طرح عشق سے خودی میں استحکام و طاقت آتی ہے، اسی طرح سوال سے اس کی قوت گھٹتی اور اس میں زوال آتا ہے، یعنی انجذاب و تسخیر کا مادّہ زائل ہوتا ہے۔ سوال کو بھی اقبال نے عشق کی طرح ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے۔ ہر وہ چیز جو بغیر ذاتی کوشش اور جد وجہد کے حاصل ہو جائے گدائی اور سوال ہے۔ خواہ وہ جنت اور وصلِ حق ہی کیوں نہو۔ دولت و ثروت وغیرہ کو میراث میں پانے والا اور افکارِ غیر کو اپنی فکر و نظر کا مدار بنانیوالا ——— سب سائل و گدا ہیں۔ جو اپنی گدائی و سوال سے اپنے وجودِ معنوی کو کمزور و فنا کرتے رہتے ہیں۔ افلاس کوئی نفرت و ذلت کی چیز نہیں، بلکہ مفلس کو ذلیل اور قابلِ نفرت صرف سوال بناتا ہے۔ اگر کسی کا نصیبہ وقتی طور پر سو گیا ہو تو اس کے عمل کو انتہائی بیدار رہنا چاہیئے، کہ یہ خود اعتمادی و خودداری کی آزمائش ہے۔ افلاس کی خودداری و خود اعتمادی ہی اصل چیز ہے۔ جو انسان کی عزت و وقار کو چار چاند لگاتی ہے۔ بلکہ یہی انسانیت کا اصلی جوہر ہے، اس لئے انسان کو ہر حالت میں نہ صرف دوسروں کے ساتھ بلکہ خود اپنے ساتھ اور اپنے خدا کے ساتھ بھی خوددار رہنا چاہیئے۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج گشتہ روبہ مزاج از احتیاج

خستگی ہائے تو از نا داری است
اصل درد تو ہمیں بیاری است
از جم ہستی مے گلفام گیر
نقد خود از کیسہ ایام گیر
از سوال افلاس گردد خوار تر
از گدائی گریۂ گر نادار تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی
بے تجلّی نخل سینائے خودی
ہست از حق خواہ با گردوں ستیز
آبروئے ملت بیضاء مریز
اے خنک آں تشنہ کاندر آفتاب
می نخواہد از خضر یک جام آب
زیر گردوں آں جوانِ ارجمند
می رود مثلِ صنوبر سر بلند
در تہی دستی شود خود دار تر
بخت او خوابیدہ او بیدار تر
چوں حباب از غیرت مردانہ باش
ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش

اِسلام کی زکوٰۃ، صدقہ وخیرات وغیرہ کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ پاشکستہ اور گداگروں کی جماعت بڑھانا چاہتا ہے۔ بلکہ اس نے غیر مستحقوں پر گدائی و سوال کی بیحد سختی سے مخالفت کی ہے۔ اور نہایت واضح طریقہ پر

فیاضی کے حدود مقرر کر دیئے ہیں کیونکہ کسی غیر مستحق کی گدائی کی ہمت افزائی کرنا اخلاق، انسانیت، اور مدنیت کا ایک ناقابلِ معافی گناہ ہے:۔

" لا تحل الصدقة لغنی

ولا لذو مرة سوی " (ترمذی)

" خیرات مالدار کو، اور جس کو کمانے کی قوت ہو اور جس کے اعضاء درست ہوں، بالکل حلال نہیں ہے"

دوسری حدیث ہے کہ:۔

" لان یاخذ احدکم حبلة فیاتی

بحزمة حطب علیٰ ظهر فیبیعها

فیکف الله بها وجهه .

(بخاری)

" تم میں سے کوئی شخص رسّی لے اور اپنی پیٹھ پر لکڑی کا گٹھا لے کر آئے اور اس کو بیچے تو خدا اسکی عزّت رکھ لیتا ہے، اس کے لئے یہ محنت اس سے کہیں بہتر ہے کہ وہ لوگوں سے مانگتا پھرے "

ایک شخص آپؐ کے پاس آیا، اور کچھ مانگا تو آپ نے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی چیز ہے، اس نے کہا ہاں ایک کمبل ہے، آپ نے وہ کمبل بیچ کر اس کو ایک کلہاڑی خرید دی اور کہا کہ جنگل سے لکڑیاں لاکر بیچا کرے۔

حضرت عمرؓ کے پاس ایک غیر مستحق گداگر آیا، آپ نے اس کو پکڑ کر ایک شخص کے پاس لوکر رکھا دیا۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو بھیک مانگتے دیکھا تو اس کو سزا دی۔

جب یاس و نامرادی اور بیم و شک کی بدلیاں چھٹ جاتی ہیں، اور بیداری و عمل کا آفتاب امیدوں اور تمناؤں کی کرنوں کو لئے ہوئے زندگی کے نصف النہار پر آکر عشق کی حرارت پاتا ہے تو خودی کی طاقتیں بے پناہ اور اس کی تسخیر ہمہ گیر ہو جاتی ہے۔ پھر کون ہے جو اس کو ٹوک سکے اور اس کی شرر افشاں نگاہوں سے آنکھیں چار کر سکے۔ دنیا کے بڑے بڑے جلیل القدر و فلک مرتبت شان و شوکت والے اور بے اندازہ دولت و حکومت والے اس مرد قلندر کی سطوت باطنی و دبدبۂ معنوی سے مرعوب ہوتے اور اس کے جلال سے تھرّا جاتے ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ وہ انگلی کے اشارہ سے چاند کے دو ٹکڑے کر سکتا ہے اور نگاہوں کی گرمی سے سمندر خشک کر سکتا ہے اس کا ارادہ خدا کا ارادہ اور اس کی مرضی خالق کائنات کی مرضی بن جاتی ہے:۔

"فلم تقتلوهم ولاكن الله

قتلهم وما رميت اذ رميت

ولاكن الله رمىٰ" (انفال)

"پس تم نے ان کو قتل نہیں کیا، بلکہ خدا نے ان کو قتل کیا۔ اور اے محمدؐ جب تم نے ان کی طرف کنکر پھینکے تو در اصل تمہارا ہاتھ خدا کا ہی ہاتھ تھا جس نے کنکر پھینکے اور ان کو شکست دی"۔

" ان الذین یبایعونک انما
یبایعون اللہ "
(فتح)

" جو لوگ تجھ سے ہاتھ ملاتے ہیں وہ درحقیقت
خدا سے ہاتھ ملاتے ہیں " ؎

از محبت چوں خودی محکم شود
قوتش فرماندۂ عالم شود
پنجۂ او پنجۂ حق می شود
ماہ از انگشتِ او شق می شود
در خصوماتِ جہاں گردد حکم
تابعِ فرمانِ او دارا و جم

یہی وہ مردِ خوددار و پختہ کار ہوتا ہے، جو زمانہ پر غالب رہتا ہے
مکان و زمان کی وسعتیں اپنی مٹھی میں سمیٹ لیتا ہے اور اس کو اپنے
ارادوں کے مطابق چلاتا ہے۔ اگر زمانہ اس کے مقرر کردہ اصولوں سے
انحراف و سرتابی کرتا ہے تو وہ اس کی گردن مروڑ دیتا ہے۔ آسمان کو
اٹھا کر زمین پر دے مارتا ہے اور موجودات کے تمام اجزا درہم برہم کر کے
ایک نیا زمانہ ترتیب دیتا ہے۔ جو اس کی نگاہوں کی گردش کے ساتھ
گردش کرتا ہے۔

مردِ خود دارے کہ باشد پختہ کار
با مزاجِ او بسازد روزگار

گر نہ سازد بامزاجِ او جہاں
می شود جنگ آزما با آسماں
بر کند بنیادِ موجودات را
می دہد ترکیبِ نو ذرات را
گردشِ ایام را برہم زند
چرخِ نیلی فام را برہم زند
می کند از قوتِ خود آشکار
روزگارِ نو کہ باشد روزگار

وہ آزادی و قوت بہت خطرناک و ہلاکت آفریں ہوتی ہے جس کی تربیت نہ کی گئی ہو، اس لئے قوتِ خودی کے اس استحکام کے بعد اس کو ہر پہلو سے مفید و کار آمد بنانے کے لئے اس کی تربیت بہت ضروری ہے ورنہ یہ بھڑکتا ہوا شعلہ بے آئینی و بدنظمی کے جھونکوں سے بے قابو ہو کر زندگی کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچاتا ہے۔ اور آخر کار خاکستر میں بدل جاتا ہے۔

تربیتِ خودی کے تین درجے ہیں ——— پہلا مرحلہ اطاعت ——— دوسرا ضبطِ نفس ——— اور تیسرا نیابتِ الٰہی!
اطاعت سے مراد ارکانِ اسلام کی پابندی ہے۔ اور مذہب کے یہ آئین وارکان سخت نہیں ہیں۔ کائنات کی ہر شئے ایک نظم و آئین کی پابند ہے کیونکہ آئین کی پابندی ہی اشیاء کو پائدار اور مفید تر بناتی ہے۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار
می شود از جبر پیدا اختیار

ہر کہ تسخیر مہ و پروین کند
خویش را زنجیریٔ آئین کند
باد را زندانِ گل خوشبو کند
قید بو را نافۂ آہو کند!
باطنِ ہر شئے ز آئینِ قوی
تو چرا غافل ز ایں سامان روی
شکوہ سنج سختیٔ آئیں مشو
از حدودِ مصطفےٰ بیروں مشو!

دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے۔ ضبط نفس انانیت و خودشناسی کی اعلیٰ ترین شکل کا نام ہے۔ کیونکہ انسان کا امتیازی کمال یہی ہے کہ اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ جس کی خواہشاتِ نفسانی اس کے قابو میں نہیں، اس کو خودشناس نہیں کہہ سکتے اور جس نے خود پر قابو نہیں پایا، اس سے تسخیر عالم کی کیا امید کیجا سکتی ہے۔ نفس کا دوسرا نام شیطان ہے۔ جو فطرت انسانی کی بہت سرکش اور بہیمیت کی طرف مائل کرنے والی قوت ہے۔ اس پر اگر قابو نہ پایا جائے تو یہ انسان پر غالب و مسلط ہو جاتی ہے پھر انسان کے دل میں غیر اللہ کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔ اور خوف تمام اخلاقی بہائیوں کی جڑ ہے۔ جو ہر طاقت کے سامنے سر جھکانے اور اس کا حکم ماننے پر مجبور کرتا ہے۔ نفس پر دستورِ الٰہی یعنی آئین شریعت کی پابندی سے غلبہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ وحدت الٰہی تمام اوہام باطلہ کو شکست کرتی اور ماسوا اللہ کا خوف دل سے نکال کر خودشناسی کے مقام پر فائز کرتی ہے۔

نفسِ تو مثلِ اشتر خود پرور است
خود پرست و خود سوار و خود سر است
مرد شو آور زمامِ او بکف
تا شوی گوہر اگر باشد خزف
ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں
می شود فرماں پذیر دیگراں
طرح تعمیر تو از گل ریختند
با محبت خوف را آمیختند
تا عصائے لا الہ داری بدست
ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ حق باشد چو جاں اندر تنش
خم نگردد پیش باطل گردنش

تربیتِ خودی کا تیسرا درجہ نیابت الٰہی ہے۔ اور یہ آخری مرحلہ ہے اس مقام پر پہنچ کر انسان خلافت اللہ فی الارض کا وارث و حقدار بن جاتا ہے۔ اور اسی کو "انسان کامل" کہتے ہیں۔ نیابت الٰہی کی استعداد ہر شخص میں موجود ہے۔ اگر وہ آئین خودی کی پابندی کرے تو اس رفعت پر سرفراز ہو سکتا ہے، جو حیات انسانی کا منتہائے کمال ہے۔

خدا کا نائب یا "انسان کامل" جسم و روح دونوں اعتبار سے انسانیت کا مکمل ترین نمونہ ہے۔ جو شجر حیات کا آخری پھل ہے۔ جسکی بادشاہت خدا کی بادشاہت ہے۔ وہ وقت کا حاکم اور بنی نوع کا مصلح ہوتا ہے۔ اخوت کا پیغامبر اور عدل و انصاف کا علمبردار ہوتا ہے۔ اسکی

فکر اس کے عمل کی ہم آہنگ ہوتی ہے وہ دنیا سے شر و فساد دور کرتا اور امن وسلامتی کا دروازہ کھولتا ہے۔ وہ رحم و محبت کا پتلا ہوتا ہے لیکن ہاتھ میں انصاف وعدل کی خارا شگاف تلوار رکھتا ہے۔ لوگ اس کے جھنڈے کے نیچے آکر حیات جاودانی پاتے اور انسانیت کا سبق پڑھتے ہیں۔ وہ دستور الٰہی کے لفاظ میں سخت دل اور معاملات اخوت وانسانیت میں انتہائی رحم دل ہوتا ہے اس کے ایک ہاتھ میں تلوار اور دوسرے میں قرآن ہوتا ہے اس کی نظر بلیغ اور افکار پختہ ہوتے ہیں۔ دماغ و دل، فکر و وجدان، عقل و عشق علم و معرفت، روح و مادہ، اور دین و دنیا میں کامل ہم آہنگی پیدا کرتا ہے۔ وہ انسانوں کے ہر ہر طبقہ کی نفسیات کا پورا پورا ماہر ہوتا ہے اور ہر مرض کی دوا رکھتا ہے۔ وہ اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب دنیا شر و فساد سے بھر جاتی ہے اور حسن کے چراغ کو باطل کی گھٹائیں چھپا لیتی ہیں۔ اس وقت وہ آکر اپنا نغمہ اس زور سے چھیڑتا ہے کہ دنیا کے تمام ہنگامے خاموش ہو جاتے ہیں اور ہر طوفان کی سانس رک جاتی ہے وہ دنیا کا نظام از سر نو مرتب کرتا اور لوگوں کو انسانیت کے صحیح نصب العین سے آگاہی بخشتا ہے۔

یہی وہ مرد حق آگاہ و انسان کامل ہے، جس کی اقبال آرزو کرتا ہے کیونکہ وہ وقت قریب ہے اور وہ تمام حالات جمع ہوتے جا رہے ہیں کہ اس نور ہدایت کا طلوع ہو۔ اقبال چشم تصور سے اس کو آتا دیکھکر انتہائی وجد وشوق کے عالم میں اس کے خیر مقدم کے لئے اٹھتا اور اس کے نقش قدم پر سجدہ پاشی کرتا ہے:-

اے سوار اشہب دوراں بیا
اے فروغ دیدۂ امکاں بیا

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

از وجودِ تو سرافرازیم ما
پس بسوزِ ایں جہاں سازیم ما

خودی کی بحث ختم کر دینے سے قبل یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ "خودشناسی" و "خودبینی" ایک چیز نہیں، بلکہ دونوں میں کافی فرق ہے، کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ اکثر اصحاب اس مغالطہ میں ہیں کہ اقبال نے خودبینی یعنی غرور و تکبر کی تعلیم دی ہے۔ چنانچہ عبدالماجد صاحب دریابادی نے اسی

مغالطہ کے زیر اثر اقبال پر ایک مرتبہ سخت تنقید کرتے ہوئے اس کے نظریہ کو گمراہ کن بتلایا۔

خودشناسی وخودبینی کے فرق کو اقبال نے "پیام مشرق" کے دیباچہ میں "امان اللہ خان سے خطاب" کرتے ہوئے جہاں اپنا اور گوئٹے کا مقابلہ کیا ہے اس شعر میں واضح کر دیا ہے:۔

ناشناسائے خودم "خودبین" نیم
با تو گویم او کہ بود و من کیم

"خودشناسی" نام ہے اعتماد علی النفس وانقیاد و ربوبیت کا اور "خودبینی" عبارت ہے کبر و نخوت، غرور و تکبر اور انحراف حق سے ــــــ پہلا جذبہ محمود ہے، جس میں نفس کی اعلیٰ طاقتیں بیدار ہو کر روح میں رفعت و پاکیزگی اور قلب میں گداز پیدا کرتی ہیں اور اخلاق سنوارتی ہیں، برعکس اس کے دوسرے جذبہ میں نفس کی صرف وہ طاقتیں اُبھرآتی ہیں، جو روح کو تاریک اور دل کو سخت بنا کر پستیٔ اخلاق کی طرف رہنمائی کرتی ہیں۔ دونوں بھڑکتے ہوئے شعلے ہیں۔ لیکن ایک آئین و اصول سے حرارت پاتا ہے اور دوسرا بے آئینی و بے اصولی سے سوزش حاصل کرتا ہے ــــــ

مگر اقبال نے کہیں کہیں خودبینی کی بھی تعریف کی ہے۔ کیونکہ خودبینی بہرحال ایک طاقت ہے اور وہ ضعف و بیچارگی کے اس "جرم" کے مقابلہ میں کہیں بلند و برتر ہے۔ جس کو قدرت کی طرف سے "مرگِ مفاجات" کی سزا ملتی ہے ۔ کمزوری و بے حسی کچی مٹی کے مانند ہے، جس سے ہر طرف ٹیار ہوتا اور ٹوٹتا رہتا ہے اور جس طرف سے اس پر دباؤ پڑتا ہے، وہ بجائے تسخیر و مقابلہ کے اسی طرف

جھک جاتی ہے، اقبال طاقت کا مداح ہے، وہ مجبوری و بے چارگی کی طرف سے نفرت سے منہ پھیر لیتا ہے، اور اس کے مقابلہ میں جب خود بینی اس کی نظر کے سامنے آتی ہے تو منہ پھیر کر نہیں گزر جاتا، بلکہ ٹھٹھک کر کچھ دیر اس کی جولانی و ستیزہ کاری کو دیکھتا ہے اس کے تڑپنے پھڑکنے میں اسے زندگی ملتی ہے، اور وہ اس کی تعریف کرتا ہے، کیونکہ خود شناسی کی بگڑی ہوئی قوت کا نام ہی خود بینی ہے ورنہ دونوں برابر کی طاقتیں ہیں اور ان کی اصل ایک ہے ــــــــ

اس سلسلہ میں اس نے "بال جبرئیل" میں جہاں ابلیس و جبرئیلؑ کا مکالمہ جس انداز پر لکھا ہے، وہ خصوصیت کے ساتھ قابل غور ہے۔ جبرئیل کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے ابلیس اس کے سامنے اپنا سوز نفس رکھتا ہے، اور ملائکہ اطاعت پر طعن کرتے ہوئے اپنی سرکشی پر فخر کرتا ہے۔ ارتقاء انسانیت کو اس کے ذریعہ جو مدد ملی ہے اس کو بھی تیسرے شعر میں دیکھئے :۔

دیکھتا ہے تو فقط ساحل سے رزم خیر و شر
کون طوفاں کے طمانچے کھا رہا ہے میں کہ تو؟

خضرؑ بھی بے دست و پا الیاسؑ بھی بے دست و پا
میرے طوفاں یم بہ یم دریا بہ دریا جو بجو!

گر کبھی خلوت میسر ہو تو پوچھ اللہ سے
قصۂ آدمؑ کو رنگیں کر گیا کس کا لہو؟

میں کھٹکتا ہوں دل یزداں میں کانٹے کی طرح
تو فقط اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو!!

ا قبال کا یہ ابلیس "گوئٹے کے مفاوسٹ" اور پروفیسر رشید احمد صدیقی

کے "شیطان" کی طرح عقل وعلم کا زبردست سفیر ہے، بلکہ ایک زندہ طاقت اور پروردۂ طوفان ہستی ہے۔ جس کو جنگ و پیکار میں راحت ملتی ہے اور الجھنے اور ٹکرانے میں لذت و زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ وہم وخوف کے ذلیل بیچاریوں کے لئے خودی کی ٹھوکر ہے، اور خود فراموشوں اور کشمکش و ذمہ داری کے تصور سے کانپنے والوں کے لئے غیرت کا تازیانہ ہے۔

جب وہ زور آزمائی میں کسی انسان کو اپنی طاقت کا حریف و مقابل نہ پاکر اپنے شعلے میں نمی اور قویٰ میں انحطاط محسوس کرتا ہے، تو ملول ہو جاتا ہے اور اپنی ایسی فتوحات پر جو لذت پیکار سے خالی ہیں خدا سے جن الفاظ میں شکایت کرتا اور ایک برابر کا حریف مانگتا ہے اس میں انسان کے لئے درس عظیم ہے!

کہتا ہے کہ اے خالق خیر و شر! —— اس انسان نے اپنے ضعف و بیچارگی سے میرے قویٰ میں گھن لگا دیا ہے، یہ اپنی خودی سے اتنا غافل اور ذوق اباکے شرار ریز دانی سے اتنا بیگانہ ہو گیا ہے کہ سرکشی و مقابلہ کی ایک جھرجھری بھی نہیں محسوس کرتا، ایسے مردہ شکار سے میرا ذوقِ صید افگنی کب آسودہ ہو سکتا ہے، جو گردن ڈالے ہوئے خود ہی صیاد کے پاس چلا آتا ہے —— میں پناہ مانگتا ہوں ایسے کورذوق و بے حس غلام کی فرمانروائی سے —— اے طاقت و زندگی کے خدا! —— میری پرانی اطاعت پر نظر کر اور اسی کے صدقے میں مجھ مرد پیر کو ان خاکی پتلیوں کے طفلانہ کھیل سے نجات دے۔ اگر اس دنیا میں سوائے گھاس پھونس اور کچھ نہ تھا تو مجھ کو اس قدر آتش نفس بنانے کی کیا ضرورت تھی —— ؟ آہ! میری تمام بلند ہمتی زنگ آلود ہو رہی ہے اور میرے عزائم پست ہوتے جا رہے ہیں۔ میں اپنی ان بے لذتِ پیکار فتوحات سے اکتا کر تیرے پاس احتجاج و مکافات کیلئے

آیا ہوں، میری فریاد سن اور ایک ایسے پختہ فطرت و خود شناس مردِ خدا کی طرف میری رہنمائی کر جو میراز بردست منکر ہو اور میری طاقتوں کا حریف و مقابل ہو جو میری گردن مروڑ سکے، اپنی نگاہ آتشیں سے میرے بدن میں لرزہ ڈال دے اور جس سے ہاتھ ملاتے ہی میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں تاکہ اس کے ساتھ تصادم و پیکار میں زندگی کا کچھ لطف پا سکوں:۔

اے خداوندِ صواب و ناصواب
من شدم از صحبتِ آدم خراب

ہیچ گہ از حکم من سر برنیافت
چشم از خود بست و خود را در نیافت

خاکش از ذوق ابا بیگانہ
از شرارِ کبریا بیگانہ

صید خود صیّاد را گوید بگیر
الاماں از بندۂ فرمان پذیر

از چنیں صیدے مرا آزاد کن
طاعتِ دیروزۂ من یاد کن

پست از و آں ہمتِ والائے من
وائے من اے وائے من اے وائے من

بندۂ صاحب نظر باید مرا
یک حریفِ پختہ تر باید مرا

لعبت آب و گل از من باز گیر
می نیاید کودکی از مردِ پیر

اندریں عالم اگر جز خس نبود
ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود
آنچناں تنگ از فتوحات آدم
پیش تو بہر مکافات آدم
منکرِ خود از تو می خواہم بدہ
سوئے آں مردِ خدا راہم بدہ
بندۂ باید کہ پیچد گردنم
لرزہ اندازد نگاہش در تنم

(جاوید نامہ)

غرض اقبال نے اپنے پیغام حیات میں ہر طرح واضح کیا ہے اور انسان کی خودی کو کہیں غیرت دلا کر، کہیں للکار کر، کہیں جھنجوڑ کر اور کہیں ٹھوکر لگا کر بیدار کیا ہے:۔

ضربتے باید کہ جان خفتہ برخیزد زخاک

نالہ کے بے زخمہ از تار رباب آید بروں

(زبور عجم)

بیخودی

خودی کے بعد بیخودی کا درجہ ہے ——

صرف انفرادیت ہی انسان کا منتہائے کمال اور آخری نصب العین نہیں، بلکہ تشکیل انفرادیت دراصل تمہید ہے تعمیر اجتماعیت کی۔ اسرار و رموز میں انفرادیت کو خودی سے اور اجتماعیت کو بے خودی سے تعبیر کیا ہے۔

خودی ایک چٹان ہے جس پر بیخودی کی بنیاد رکھی جاتی ہے۔ اقبال موجودہ
نازی ازم، اور فیشزم وغیرہ کی طرح انفرادیت کو خاروخس بنا کر ہوس پرست
اجتماعیت کی آگ میں نہیں جھونک دینا چاہتا۔ وہ شخص کا احترام کرتا اور
اس کو جماعت کا ایک بے روح اور بے دماغ حلقہ بگوش غلام نہیں بناتا بلکہ
اس کے نزدیک اجتماعیت زیادہ طاقت ور، ہمہ گیر اور عادل پرور اسی وقت
ہوسکتی ہے کہ پہلے اشخاص میں انفرادیت و خود اعتمادی کی روح پھونکی جائے
اور اگر انفرادیت کو مستحکم کئے بغیر اجتماعیت کی تشکیل کی جائے تو وہ منجمد
پہاڑ نہیں ریت کے ایک ڈھیر کی طرح ہوگی جس کو معمولی ہوا کے جھونکے منتشر
کر سکتے ہیں۔

یہی وہ اسلام ازم ہے جس میں تشکیل اجتماعیت کا سنگ بنیاد انسان
کی انفرادیت کا استحکام ہے، جس کو اسلام کی اصطلاح میں "توحید" کہتے
ہیں۔ توحید کا جو بلند ترین تصور اسلام نے پیش کیا ہے، وہ دنیا کے کسی مذہب
میں نہیں پایا جاتا مسلمانوں کا عقیدۂ توحید، بہت وسیع و ہمہ گیر ہے۔ جو
خودی کا بھی سنگ بنیاد ہے اور بیخودی کا بھی ——— توحید وہ زبردست
طاقت ہے جس سے واقف ہو کر عرب کے غیر متمدن و وحشی قبائل دیکھتے ہی
دیکھتے تمام دنیا پر چھا گئے تھے اور وہی سب سے کامیاب اور مرعوب تہذیب
کے حامل ہوئے تھے جنھوں نے بڑے بڑے تمدن کو خالص اسلامی
رنگ دیا تھا اور ان کے نعروں سے زمین و آسمان تھرا جاتے اور جلال
و جبروت والے سلاطین کے سروں سے تاج گر پڑتے تھے۔ کیونکہ توحید
انسان کو بیخوفی و جراءت کی تعلیم دیتی ہے۔ اور گمان و شک مٹا کر
عزم و یقین استوار کرتی ہے۔ توحید انتشار کو اجتماع میں بدل کر زندگی و عمل

کی آبیاری کرتی ہے۔ وحدت کو کثرت بناتی اور کثرت کو وحدت کی شکل دیتی ہے۔

لوگ دنیا میں سینکڑوں قوتوں کے محکوم تھے، بہت سی زنجیریں ان کی گردن اور پیروں میں لپٹی ہوئی تھیں، اور بے شمار چوکھٹیں انکی جبیں سائی کے لئے وقف تھیں۔ توحید نے تمام باطل قوتوں کو مٹاکر صرف ایک قادر و توانا قوت کے سامنے اِنسان کے ذوق عبودیّت کو جھکجانے کا حکم دیا۔ مختلف سمتوں میں کھینچنے والی تمام ہلکی ہلکی زنجیریں توڑ کر صرف ایک بوجھل اور لابنی زنجیر گردن میں ڈالدی اور لا تعداد آستانوں سے اس کا سر اٹھاکر صرف ایک بلند و برتر چوکھٹ پر ڈال دیا۔

موحد دنیا میں کسی سے مرعوب و خوف زدہ نہیں ہوتا۔ اور کسی کے آگے سر نیاز نہیں جھکاتا، وہ صرف حاکم حقیقی کا حکم مانتا اور سربلند رہتا ہے اس کی پیشانی کے جھکنے کے لئے بھی ایک چوکھٹ اور اس کے دل کی خریداری کے لئے بھی ایک خریدار ہے۔ وہ اگر دنیا میں کسی دوسری ہستی کی اطاعت کرتا اور کسی علاقہ کو تسلیم کرتا ہے تو محض اس لئے کہ اس ذاتِ واحد نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ چنانچہ اس کی بہت سی اِطاعتیں بھی اسی ایک طاعت کا جزو بن جاتی ہیں اور بہت سے علاقے اسی ایک مضبوط رشتے میں مِل کر بٹ جاتے ہیں۔ اس کی تمام انفرادی و اجتماعی حرکات کا مرکزی نقطہ بھی ایک توحید ہے دنیا کی جتنی اطاعتیں، فرمانبرداریاں اور محبتیں ہیں وہ صرف اسی وقت تک کے لئے ہیں کہ ان سے توحید کی پاکیزگی پر دھبہ نہ آئے، اور حاکم مطلق کی وفاداری و محبت میں خلل نہ پڑے۔ لیکن جہاں اس اصول پر ضرب پڑتی ہو تو پھر مرد مومن کے لئے دنیا کی تمام جاں نثاریاں، وفاداریاں

تمام الفتیں اور محبتیں اور تمام چاہتیں و رغبتیں، بغاوت جنگ میں بدل جاتی ہیں ——— اس وقت تمام رشتوں سے انکار اور تمام محبتوں سے انقطاع ہے ——— اللہ کی حکومت و بادشاہت کے مقابلہ میں نہ کوئی حاکم، حاکم ہے، نہ کوئی محبوب، محبوب! کیونکہ حاکم حقیقی کے ساتھ جو عہد ہو چکا ہے اس کے آگے تمام عہود و مواثیق بے قیمت ہیں۔ مسلمان کی انفرادیت و اجتماعیت کا اور تمام مادی و روحانی ترقیوں کا بنیادی پتھر توحید اور صرف توحید ہے ——— اور جب سے اسلامیان عالم کی گرفت اس رسّی پر سے ڈھیلی ہوئی ہے تو نہ ان کے انتشار کی کوئی روک رہی ہے اور نہ اس کے انحطاط کے لئے کوئی حد ——— آہ! سے

زندہ قوت تھی جہاں میں یہی توحید کبھی
آج کیا ہے؟ فقط اک مسئلۂ علم کلام!

روشن اِس ضو سے اگر ظلمتِ کردار نہ ہو
خود مسلماں سے ہے پوشیدہ مسلماں کا مقام

میں نے اے میرِ سپہ! تیری سپہ دیکھی ہے
قل ہو اللہ کی شمشیر سے خالی ہیں نیام!

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ
وحدت افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے؟
اس کو کیا سمجھیں یہ بیچارے دو رکعت کے امام

(ضربِ کلیم)

اِسرار و رموز کے آخر میں اقبال نے "سورۂ اِخلاص" کی اپنے مخصوص انداز میں تفسیر کرتے ہوئے توحید کے نکات کو دل کھول کر واضح کیا ہے۔ خودی تکمیل و تربیت کے بعد اقبال فرد کی وحدتوں کے ان منتشر ذرات کو جمع کر کے وحدتِ اجتماعی کی صورت میں فلک فرسا پہاڑ بنا دینا چاہتا ہے فردیت کی تلوار اِسی لئے بنائی جاتی ہے کہ جماعت کے ہاتھ میں دیدی جائے ورنہ اس سے خود فردیت اور انانیت مجروح ہونے لگتی ہے۔ خودی کی تکمیل کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ وہ جماعت میں خود شکن ہو کہ قطرہ سے سمندر، ناز سے نیاز، اور برگ گل سے چمن بن جائے۔ جماعت میں ملجانے کے بعد فردیّت یعنی انانیّت "میں" چھوڑ کر "تو" کا لقب اختیار کر لیتی ہے پھر جو کچھ دیکھتی ہے، جماعت کی آنکھ سے دیکھتی ہے، جو سنتی ہے، جماعت کے کانوں سے سنتی ہے اور جو بھی کرتی ہے جماعت کے ہاتھ سے کرتی ہے۔ —— اِس حلقہ کے اندر آکر وحدت میں کثرت کا مشاہدہ کرتی ہے اور کثرت میں وحدت کا؛

فرد تا اندر جماعت گم شود
قطرۂ وسعت طلب قلزم شود

در زبانِ قوم گویا می شود
بر رہِ اسلاف پویا می شود

وحدتِ او مستقیم از کثرت است
کثرت اندر وحدت است و وحدت اندر کثرت است

ناز تا ناز است کم خیزد نیاز
ناز ہا سازد بہم خیزد نیاز

در جماعت خود شکن گردد خودی
نا ز گلبرگے چمن گردد خودی

فرد کا رابطہ جماعت کیلئے ضروری ہی نہیں، ناگزیر ہے، کیونکہ جماعت کی بقا فرد کی بقا اور جماعت کا سوال فرد کا سوال ہے۔ فرد کی عزت و شان عظمت و وقار اور مسرت و ارتقا سب کچھ جماعت سے وابستہ ہے، جماعت سے الگ ہو کر وہ ایک ایسا قطرہ ہے جو بہت جلد زمین میں سو جانے والا ہے اور ایک ایسا پتہ ہے جو شاخ سے گر کر تازگی، سرسبزی اور بہار و زندگی کی ہواؤں سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو گیا ہے ———— جماعت اس کو زندگی کے صحیح نصب العین سے آگاہ کرتی اور اس کی قوت کو انتشار و آشفتگی کے گھن سے محفوظ رکھتی ہے فردیت کی تباہ کن آندھی کو جماعت ضبط و آئین سے جان پرور نسیم بناتی اور خودی کا شعلہ جماعت کے سوز سے ہی اصلی حرارت پاتا ہے۔

فرد جب اس طرح جماعت میں گھل مل جاتا ہے، تو جماعت میں وہی بے اندازہ قوت آجاتی ہے جو شخص میں تھی۔ بلکہ اس سے کہیں زیادہ۔ کیونکہ جماعت کی خودی افراد کی خودیوں سے ملکر بنتی ہے اور فرد و قوم ایک دوسرے کے ہم شکل و ہم نظر ہوتے ہیں۔ جس قوم میں اجتماعیت نہیں اس کی دنیا میں کوئی ساکھ قائم نہیں ہو سکتی۔

"وان تنازعوا فتفشلوا
وتذهب ريحكم واصبروا
ان الله مع الصابرين" (انفال)

"اور آپس میں خانہ جنگی کر کے اپنی وحدتِ اجتماعی
میں پھوٹ مت ڈالو۔ اگر ایسا کروگے تو تمہارا
اجتماعی شیرازہ بکھر جائے گا تمہاری قوت ضائع
ہو جائے گی۔ اور دشمنوں پر جو تمہارا اثر ہے،
جاتا رہے گا۔ پس اپنی جماعت کو مضبوط کر کے اپنے
اندر ثبات و استقامت پیدا کرو اور اللہ پر
بھروسہ رکھو کہ خدا کی مدد صاحبانِ صبر و استقامت
ہی کے ساتھ رہتی ہے" ؎

فرد را ربطِ جماعت رحمت است
جوہر او را کمال از ملت است

تا توانی با جماعت یار باش
رونقِ ہنگامۂ احرار باش

فرد می گیرد ز ملت احترام
ملت از افراد می یابد نظام

برگ سبزے کز نہالِ خویش ریخت
از بہاراں تارِ امیدش گسیخت

فرد تنہا از مقاصد غافل است
قوتش آشفتگی را مائل است

قوم با ضبط آشنا گرداندش
نرم رو مثلِ صبا گرداندش

چوں اسیر حلقۂ آئیں شود
آہوئے رم خوردۂ شکیں شود

جس طرح فرد کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اپنی خودی کو جماعت میں گم کر دے اسی طرح جماعت کا منتہائے کمال یہ ہے کہ اس میں فرد کی طرح خودی کا احساس پیدا ہو جائے۔ فرد جماعت ہو اور جماعت فرد، یعنی فرد میں یگانگت اخوت و مساوات اس طرح ہو کہ فرد کا عہد جماعت کا عہد ہو، جس طرح جماعت کا عہد فرد کا عہد ہوتا ہے۔ یہ احساس اخوت ملی کے وقار و ساکھ اور اس کی بقاء و ارتقاء کے لئے بہت ضروری ہے:۔

ہر یکے از ما امینِ ملت است
صلح و کینش صلح و کینِ ملت است

ملت از گردد اساس جان فرد
عہدِ ملت می شود پیمان فرد

علاوہ ازیں اجتماعیت کا دائرہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا کہ ملت کے اندر سے طبقاتی تقسیم فنا نہ کر دی جائے۔ اجتماعی قوانین کا نفاذ بغیر کسی فرق و مرتبہ کے اور بغیر کسی ادنیٰ تامل کے ہر ایک پر یکساں ہو۔ وحدت ملی میں آقا و غلام کی دو صفیں نہ ہوں۔ ملت کا رشتہ تمام رشتوں سے زیادہ مستحکم اور مقدس سمجھا جائے۔ معاشرت ملی میں کوئی ناگوار و قابل نفرت نشیب و فراز نہ ہوں۔ بادشاہ و غلام ایک صف میں کھڑے ہوں اور ایک دستر خوان پر بغیر کسی رکاوٹ کے بیٹھیں:۔

عہدِ مولیٰ کمتر از احرار نیست
خون شہ رنگین تر از معمار نیست

پیشِ قرآں بندہ و مولا یکیست
بوریا و مسندِ دیبا یکے است

اقبال نے اس اخوتِ ملّی کو "رموز" میں حضرت ابو عبیدہؓ و جابان اور سلطان مراد و معمار کی دو حکایتوں کے ذریعہ ذہن نشین کرایا ہے جن کے اشعار اوپر درج ہوئے۔

جماعت میں مثلِ فرد کے خودی و خود اعتمادی کا احساس کیونکر پیدا ہوتا اور اس اخوتِ ملّی کی تولید و تکمیل کس طرح ہوتی ؟ اس کا دار و مدار ملّت کی روایاتِ کہنہ کے انضباط یعنی تاریخ کی حفاظت و اشاعت پر ہے۔ اگر قوم اپنی تاریخ بھلا دے اور اپنے ماضی سے آنکھیں بند کرے تو اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ قرآن نے اس نکتہ کو کسی جگہ فراموش نہیں کیا۔ کیونکہ قوم کی روح اس کی تاریخ ہے۔ جس طرح فرد جان و تن کے ارتباط سے زندہ رہتا ہے۔ اس قوم کی زندگی اس کے حفظِ ناموسِ کہن سے وابستہ ہے:۔

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن
زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

نہالِ قومیت کی آبیاری تاریخ سے ہوتی ہے۔ تاریخ محض چند قصوں اور افسانوں کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قوموں کی خود آگاہی و خود شناسی کا نسخہ ہے۔ اس سے روحِ قومیت بیدار ہوتی اور قوت پکڑتی ہے:۔

چیست تاریخ اے ز خود بیگانہ ؟
داستانے قصۂ افسانۂ ؟
ایں ترا از خویشتن آگہ کند
آشنائے کار و مرد رہ کند

روح را سرمایۂ تاب است ایں
جسمِ ملت راچو اعصاب است ایں
ہمچو خنجر بر فسانت می زند
باز بر روئے جہانت می زند
ضبط کن تاریخ راپا ئندہ شو
از نفسہائے رمیدہ زندہ شو

حفظِ روایاتِ ملیہ کا سب سے بڑا ذریعہ قوم کی مائیں ہیں۔ ان کی آغوش دراصل قوم کے گہوارے ہیں، جن میں قومیں پلتیں اور تربیت پاتی ہیں۔ ——— مائیں اگر چاہیں تو اپنے بچوں کے ذہن میں اسلاف کے کارنامے نقش کر کے ان کو قومی وقار و عظمت کا مظہرِ کامل بنا سکتی ہیں۔ کیونکہ خود دار و حق پرست افراد ہی قوم کا اصلی سرمایہ اور اس کے لئے باعثِ فخر ہیں۔

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر
نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مالِ او فرزندہائے تندرست
تر دماغ و سخت کوش و چاق و چست

اِس لئے عورت کی اصلی فضیلت و تقدیس کا راز اس کی امومت میں ہے ——— وہ امت کی بنیاد ہے۔ رسول اللہ صلعم نے اپنی دلپسند چیزوں یعنی نماز و خوشبو کے ساتھ عورت کا ذکر اس کے ماں ہونے کی حیثیت سے ہی فرمایا ہے۔ اور لوگوں کو بشارت دی ہے کہ:۔

" الجنۃ تحت اِقدام الامہات

"جنت ماؤں کے پیروں کے نیچے ہے ــــــ"

عورت کے ماں ہونے کی حیثیت اس کی دوسری تمام حیثیتوں پر افضل و برتر ہے، ایک عورت اگر ایک بہتر ماں نہیں بن سکتی ہے تو وہ ایک بچہ پیدا کرنے والی مشین سے کسی طرح بہتر نہیں۔ اس کا وجود اپنے دیگر کمالات کے ساتھ بھی اِنسانی و قومی نقطۂ نظر سے بیکار و مضر ہے۔ اس کے مقابلہ میں وہ جاہل و دیہاتی عورت ہزار درجہ افضل و قابلِ عظمت ہے، جس کی گود قوم میں ایک فداکار و خودشناس فرد کا اضافہ کرے ــــــ سیدۃ النساء حضرت فاطمۃ الزہراؓ کو تمام عورتوں پر اس لئے فضیلت ہے کہ ان کے پہلو میں حسینؓ جیسے غیور و فخرِ ملت نوجوان نے پرورش پائی۔ قوم کی سب سے اہم ذمہ داری ان کی ماؤں پر ہی ہے وہ اگر چاہیں تو اپنے بچوں کو حسینؓ کا نمونہ بنا سکتی ہیں چاہیں تو شمر و یزید کا ــــــ اقبال نے کافی تفصیل کے ساتھ عورتوں کو ان کے فرائضِ مادری سے آگاہ کیا اور ان کی فضیلتِ امومت کو واضح کیا ہے اور آخر میں اِنتہائی ذوق و شوق اور جوش و خروش سے امت کی ماؤں کو خطاب کرنے اور ان کی گود سے قربان گاہِ ملت کے لئے ایک حسینؓ طلب کیا ہے:ـ

اے امینِ نعمت آئینِ حق
در نفسہائے تو سوزِ دینِ حق!
آب بندِ نخلِ جمعیت توئی
حافظِ سرمایۂ ملت توئی
ہوشیار اے دستبردِ روزگار
گیر فرزندانِ خود را درکنار

تا حسینے ٔ شاخ تو بار آورد

موسم پیشیں بگلزار آورد

اب قوم کے اغراض و مقاصد اور آئین و ضوابط پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ "قوم" کیا ہے اور کس طرح بنتی ہے؟ چند انسانوں کو اکٹھا ہو جانے کو قوم نہیں کہتے۔ بلکہ قوم نام ہے چند دماغوں کے کسی ایک مرکز پر جمع ہو جانے کا۔ قوم کے لئے اشتراک جسم و اجتماع بدن اتنا ضروری نہیں جتنا اشتراکِ دماغ۔ اور وحدتِ خیال لازمی ہے۔ اگر چند سو آدمی اتفاقاً کسی میدان یا مکان وغیرہ میں وقتی طور پر جمع ہو جائیں اور ان کے مقاصد و نصب العین مختلف ہوں جیسے کسی سیرگاہ یا مسافروں کے قافلہ میں لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے ——— تو ان کی حیثیت ایک انبوہ سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر ان چند سو کی جگہ صرف چند گنتی کے آدمی دنیا کے دور دراز چند گوشوں میں علیحدہ علیحدہ ہوں اور وہ کبھی ملتے بھی نہوں مگر ان کی زندگی کی ہر حرکت ایک نصب العین کے ماتحت ہو اور ان کا مرکز خیال ایک ہو تو بلاشبہ ان سینکڑوں نفوس کی بھیڑ سے وہ ہر طرح وقیع و قابل احترام ہیں ——— اور ایسے افراد پر "قوم" کا اطلاق ہو سکیگا۔ کیونکہ اشتراک مقصد و خیال کا روحانی ارتباط ان چند گنتی کے دماغوں کو ایک کرکے ان سینکڑوں مختلف الخیال آدمیوں کی بھیڑوں پر وزنی بنا دیا ہے کئی سو آدمیوں کے ایک جگہ جمع ہو جانے پر بھی ان کو بجز کسی عارضی و وقتی ضرورت کے، نصب العین و مقاصد کا اختلاف ایک نہیں کرتا وہ ریت کے ذرے ہیں جو ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ منتشر و پراگندہ ہو جانے والے ہیں۔ لیکن جدا جدا رہنے والے چند گنتی کے آدمیوں کی دماغی وحدت ایک پہاڑ اور ایک چٹان کی مانند ہے

اور جب تک اس میں کشش خیال و انجذاب نصب العین باقی ہے، کوئی بھی قوت اور حادثہ عظیمہ اُسے نہیں توڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سوشلسٹ جو دنیا کے کسی خطۂ میں پیدا ہوا ہو اور کسی گوشہ میں رہتا ہو، اپنے آپ کو روس کی ملت اشتراکیت سے وابستہ سمجھتا ہے۔ وہ روسیوں کی حرکت وعمل پر آگاہی کا سب سے زیادہ مشتاق رہتا ہے۔ ان کی ترقی سے بے اندازہ مسرت حاصل کرتا ہے اور ان کی تکذیب کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ ہر وقت نہایت غصہ اور جوش کے ساتھ ملت روسیہ : اصول اشتراک کی حمایت کرتا ہے۔ اگرچہ اس نے روس کبھی نہ دیکھا ہو اور نہ دیکھنے کی آیندہ کوئی امید ہو ———— اسی طرح ایک مسلمان جو دنیا میں کہیں رہتا ہو ہر وقت مکہ اور کعبہ سے وابستہ رہتا ہے اگرچہ اس نے کعبہ کی زیارت نہ کی ہو کیونکہ وہ اس کے خیال و روح کا حقیقی مرکز ہے۔ اس کے نہال قومیت کی آبیاری اسی سرچشمہ سے ہوتی رہتی ہے۔ وہ انگاروں پر لوٹتے ہوئے بھی ایک لمحہ کے لئے یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کے اس ذہنی و روحانی مرکز پر غیر مسلموں کا تسلط ہو۔ کعبہ کو بھلا دینے کے بعد اس میں کسی صورت سے حرارت قومی باقی نہیں رہ سکتی۔ اسی لئے وہ ان میں پانچ مرتبہ اسی طرف رُخ کر کے عبادت کرتا۔ اور اپنے رشتۂ ملّی کو ہر وقت پیشِ نظر رکھتا ہے:-

دل مقامِ خویشی و بیگانگی است
شوق را مستی زہم پیمانگی است

ملت از یکرنگیٔ دلہا ستے
روشن از یک جلوہ ایں سیناستے

قوم را اندیشہ ہا باید یکے
در ضمیرش مدعا باید یکے
جذبہ ہا باید سرشت او یکے
ہم عیار خوب و زشت او یکے

لیکن لوگ اشتراک قلب و ضمیر کے رشتہ میں بھی خود بخود منسلک نہیں ہو جاتے۔ اس کے لئے ایک صاحب دل انسان کامل کی ضرورت ہوتی ہے جو افراد میں روحانی اختلاط و قومی اشتراک پیدا کر کے ان کو "قوم" بنا دیتا ہے۔ اسی صاحب دل بانیٔ قوم کو نبی و پیغمبر کہتے ہیں۔ وہ اپنی قوت روحانی سے تفردوں کو باہم وصل کر کے سمندر بنا تا ______ اور ان کو توہمات کی زنجیروں سے آزاد کر کے حیات کے حقیقی نصب العین سے آگاہ کرتا ہے۔

وہ تنہا اٹھتا ہے اور اس عزم کے ساتھ کہ اگر سوچتے انسان میرے ساتھ نہیں چل سکتے تو دنیا کے ہر پتھر اور ہر درخت کو میرے پیچھے آنا پڑے گا اور اس کے پاس بجز دل کی قوت کے اور کوئی مادی طاقت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ پکارتا ہے تو کنکروں سے لبیک کی صدا آتی ہے، وہ اشارہ کرتا ہے۔ اور آسمان سے بجلیاں اس کے قدموں میں اتر آتی ہیں، وہ دیکھتا ہے۔ اور خاک کے ذرے اس کے گرد رقص حیات کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس کا انتظار نہیں کرتا کہ اس کے ہمخیال اس کے پاس آکر "قوم" بننے کی استدعا کریں بلکہ اس کے غفلت شکن نعرہ کو سن کر قدم خود بخود اس کی طرف کھنچنے لگتے ہیں۔ اور بھٹکے ہوئے دماغ اس کے قائم کئے ہوئے نقطہ کے گرد جمع ہونے کے لئے مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ کسی مادی امداد کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ خود اپنے

وجود کے اندر پوری ایک قوم کا حقیقی مظہر ہوتا ہے:۔

" ان ابراھیم کان امۃً

قانتاً للہ حنیفاً " (نحل)

" بیشک حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اپنے وجود واحد
کے اندر ایک پوری قوم اور خدا پرست اُمت تھے "

تا خدا صاحب دلے پیدا کند
کو ز حرفے دفترے املا کند

ساز پردازے کہ از آوازۂ
خاک را بخشد حیاتِ تازۂ

دیدۂ او میکشد لب جاں دمد
تا دوئی میرد یکے پیدا شود

تازہ انداز نظر پیدا کند
گلستاں در دشت در پیدا کند

بندہا از پا کشاید بندہ را
از خداوندان رباید بندہ را

گویدش تو بندۂ دیگر نہٖ
زیں بتانِ بے زباں کمتر نہٖ

تا سوئے یک مدعائش می کشد
حلقۂ آئین بپایش میکشد!

جس طرح افراد خاک سے پیدا ہوئے ہیں، اسی طرح قوم ایک صاحب دل کے سوزِ باطن سے وجود میں آتی ہیں:۔

فرد می خیزد از مشتِ گلے

قوم زاید از دلِ صاحبدلے

فرد روح و بدن کے اتصال سے زندہ رہتا ہے اور قوم اپنے حفظِ ناموسِ کہن سے زندگی پاتی ہے:۔

زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن

زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن

روح کے بدن سے نکل جانے پر فرد کی موت واقع ہوتی ہے اور ترکِ مقصودِ حیات کرکے اشتراکِ قلب و دماغ کا رشتہ توڑ دینے سے قوم پر موت طاری ہو جاتی ہے:۔

مرگِ فرد از خشکیِ رودِ حیات

مرگ قوم از ترکِ مقصودِ حیات

اس اُصول قومیت کے پیشِ نظر اقبال کے سامنے اقوام و ملل میں سے بہترین اور مکمل ترین مثال ملت اسلامیہ کی ہے۔ جس کا وہ خود ایک نمایندہ ہے۔ لہذا اپنے نظریہ بیخودی میں اسی کو پیشِ نظر رکھتا اور اسی کی مثالیں دیتا ہے اسلام نے دنیا کو اخوت کا سبق پڑھایا۔ رنگ و نسل کے تمام امتیازات مٹا کر سب کو ایک ارتباط قلبی و رشتۂ روحانی میں منسلک کیا، شرک

و بت پرستی اور خوف و شک کی زنجیریں توڑ کر وحدت کی تعلیم دی۔ ملت
اسلامیہ موجودہ بد قومیتوں کی طرح مخصوص جغرافیائی حدود تنگ حلقہ میں
محصور نہیں۔ اس کی تعمیر آب و گل سے نہیں ہوئی اور نہ اس کی بنیاد اقتصادی
وسعت پر ہے۔ بلکہ یہ مرکز قلب و روح اور وحدت دماغ و خیال پر تعمیر
ہوتی ہے۔ اس کے سامنے ایک بہت اعلیٰ و ارفع نصب العین ہے اسلئے
نہ تو یہ حدود مکانی کی پابند ہے نہ ۲ - زمانی کی۔ تمام روئے زمین اس کا
وطن ہے، اور اس کی زندگی کے لئے مدت کا کوئی تعین نہیں، وہ ہمیشہ زندہ
رہیگی اور ہر زمانہ میں اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا رہیگا!

قوم کے استحکام و تقویت کے لئے ضروری ہے، عالم روحانیت کے
علاوہ موجودات میں بھی اس کا ایک مرکز محسوس ہو۔ جس سے اس کی حمایت
میں تازگی و پختگی آتی رہے۔ مرکز سے شیرازۂ قومی کی بندش مضبوط
رہتی ہے۔ اور جو قوم اپنے مرکز محسوس کو کھو دیتی ہے اس کا وقار زائل ہو جاتا
ہے۔ اور بازار عالم میں اس کی معمولی سا کھ بھی نہیں رہتی۔ پھر اس کی ترقی رک
ہی نہیں جاتی۔ بلکہ اس کے بڑھتے ہوئے زوال و انحطاط کو کوئی قوت
نہیں روک سکتی۔ وہ دنیا میں بس ذلت و غربت کی ٹھوکریں کھانے کے لئے
زندہ رہتی ہے۔ اس کی زندہ و عبرت خیز مثال ہمارے سامنے یہودیوں
کی ہے۔ یہ موسیٰ و ہارون ؑ کی امت جو دنیا کی بہت قدیم قوم ہے اور کئی
رسولوں کی گود میں پل چکی ہے۔ اس کے ہاتھ سے جب بیت المقدس
کا دامن چھوٹا جو اس کا مرکز قومی تھا، تو اب تک بجز غربت و ذلت کے
دنیا کی نظر میں اس کی کوئی ساکھ نہیں، اور نہ اس میں وہ قوت باقی رہی ہے
کہ جس کو قومی طاقت یا قومیت کہا جاتا ہے۔ حالانکہ وہ دنیا میں سب سے

زیادہ مالدار ہے۔

اس لئے مرکزِ قومی کو کسی صورت میں نہ چھوڑنا چاہیئے، اور نہ کسی لمحہ اس کو فراموش کرنا چاہیئے کہ اس کی وابستگی نہالِ قومیت کو سر سبز رکھتی اور اس میں پھل لاتی ہے۔ ملتِ اسلامیہ کے لئے یہ مرکز کعبہ ہے ـــ جس سے اس کی اجتماعیت و وحدانیت اور قوت و ترقی وابستہ ہے، اور جو امن و ثواب کا گھر ہے۔

" واذجعلنا البیت مثابۃ للناس

وامنا واتخذ وامن مقام ابراھیم

مصلّٰی " (بقرہ)

" اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ ہم نے کعبہ کو لوگوں کے لئے ہر قسم کی بھلائی اور امن کا گھر بنا دیا اور تم نماز کے لئے مقام ابراہیم کو پکڑے رہو یعنی اس سے اپنی وابستگی مت چھوڑو، کہ اس میں تمہارے لئے امن و بھلائی ہے "

دوسری آیت ہے:۔

ان اوّل بیت وضع للناس

للذی ببکۃ مبارکا وھدیً

للعٰلمین فیہِ آیات بینات مقام

ابراهیمؑ ومن دخلہٗ کان آمنا ؕ
(آل عمران)

" دنیا کے عبادت کدوں میں سب سے پہلا گھر انسانوں
کے لئے پرستش گاہ بنایا گیا، وہ صرف کعبہ ہے جو مکہ میں
تمام عالم کی برکت و ہدایت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے
اس میں ہماری روشن نشانیوں میں سے ایک
نشانی مقام ابراہیم ہے، پس جو شخص اس میں
داخل ہوا وہ ہر طرح کی امن و سلامتی میں آگیا ۔۔۔ "

قوم را ربط و نظام از مرکزے
روزگارش را دوام از مرکزے

راز دار و رازِ ما بیت الحرام
سوزِ ما ہم سازِ ما بیت الحرام

در جہاں جانِ امم جمعیت است
در نگر سرِ حرم جمعیت است

عبرتے اے مسلم روشن ضمیر
از مآلِ امتِ موسیٰ بگیر

داد چوں آں قوم مرکز را ز دست
رشتۂ جمعیتِ ملت شکست

دہر سیلی بر بنا گوشش کشید
زندگی خوں گشت و از چشمش چکید

از گل عبرت زباں گم کردۂ
ہم نوا ہم آشیاں گم کردۂ
اے ز تیغ جور گردوں خستہ تن
اے اسیر التباس و وہم و ظن
پیرہن را جامۂ احرام کن
صبح پیدا از غبار شام کن
مثل آبا غرق اندر سجدہ شو
آنچناں گم شو کہ یکسر سجدہ شو!

مرکزِ قومی کے علاوہ ہر قوم کے لئے کچھ بنیادی اصول ہوتے ہیں۔ جن پر قومیت تعمیر کی جاتی ہے ــــــ ملتِ اسلامیہ کے اساسی اصول دو ہیں، پہلا اصول ــــــ توحید ہے یعنی" لا الٰہ الا اللہ" توحید کا مطلب یہ ہے کہ دنیا و آخرت میں بجز خدائے واحد و قہار کے اور کوئی ہستی نہیں جو لائق پرستش ہو، اور کوئی آستانہ سر جھکانے کے قابل نہیں بجز آستانہ خدا کے۔ وہ ذات مطلق ہے، بے مثل ہے، یکتا ہے! اور ذات و صفات میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اس قادر و قیوم کے سوا جو " لم یلد و لم یولد" ہے ہر طاقت باطل اور ہر قوت نا قابل اعتناء ہے۔ تمام خوف و نیازمندیاں اسی کے لئے، تمام عبودیتیں اسی کے واسطے ہیں اور تمام حاجتیں اسی سے وابستہ ہیں:۔

" و تعز من تشاء و تذل من تشاء
بیدك الخیر انك علیٰ كل شيءٍ قدیر •

"جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت،
سب کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر قادر ہے"

توحید نوعِ انسانی کو طبقاتی تقسیم سے مٹا کر اخوت کے رشتہ میں منسلک کرتی ہے۔ عزم و ہمت پر جلا کرتی اور خدا کے سوا تمام مادی طاقتوں کے مقابلہ میں نڈر بناتی ہے کیونکہ انسان کی فطرت میں خوف بھی آمیز کیا گیا ہے اس لئے اس کے جذبہ کی تسکین کے واسطے کسی ایک ایسی ہستی کا تصور ضروری ہے جو سب سے برتر ہو اور ہر چیز پر قادر و غالب ہو تاکہ خوف اعتدال پر آکر شجاعت کے لئے مفید تر بن سکے۔ ورنہ وہ ہر ہر طاقت کے آگے لرزتے ہوئے سربسجود ہونے لگتا ہے۔ اس تصور کی مکمل ترین صورت کا نام "توحید" ہے۔ وہ یاس و شک اور غیر اللہ کا خوف اور ہر طرح کا حزن مٹا کر عزم و یقین، ہمت و شجاعت، آرزو و امنگ پیدا کرتی ہے اور تمام ترقیوں اور کامیابیوں کا پیش خیمہ بنتی ہے۔ یہ توحید ہی کا کرشمہ تھا کہ صحرائے عرب کے مٹھی بھر غیر متمدن باشندے چشم زدن میں اس بلندی پر جا پہنچے کہ تمام متمدن دنیا کو اپنے زیر فرمان لے آئے۔ اور تہذیب و تمدن کا سبق پڑھانے لگے۔ پرستاران توحید کو مرعوب کرنے کے لئے اکاسرۂ عجم و قیاصرۂ روم نے اپنے مادی شوکت و جلال اور دولت و قوت کے کیسے کیسے عظیم الشان مظاہرے نہیں کئے مگر ان مردان حق کا فقر غیور کسی مقام پر نہیں ٹھٹھکا اور نہ کسی مظاہرے سے مرعوب و محجوب ہوا۔ وہ مئے توحید کے متوالے پیوند لگے لباس میں جس دربار میں جاتے ان کی خود اعتمادی و بے باک صداقت، تمام قوت و شوکت کی چھاتی دھڑکا دیتی۔ ان کی سیر چشمی و بے نیازی ساری گراں بہا آرائش و نمائش حقیر و بے رنگ کر دیتی۔

اور ان کے جلال و جبروت کی ہیبت سے پورا دربار لرز جاتا۔ ان کی آنکھ
بیش قیمت کپڑوں اور مرصع ہتھیاروں کی چمک سے کبھی جھپکنا نہیں
جانا، اور نہ ان کی سربلندی نے ایران و روم کے سورماؤں کے آگے
جھکنا سیکھا۔ اور نہ ان کی خطابت کسی نخوت و بیزاری کی تاب لائی۔

اہلِ حق را رمزِ توحید از بر است
در "آتی الرحمٰن عبدا" مضمر است

ملت بیضا تن و جاں لا الٰہ
ساز مارا پردہ گرداں لا الٰہ

اسود از توحید احمر می شود
خویش فاروق و ابوذر می شود

مرگ را ساز انقطاع آرزو است
زندگانی محکم از "لا تقنطو" است

قوتِ ایماں حیات افزایدت
ورد "لا خوف علیہم" بایدت

بندۂ حق پیش مولیٰ "لا" استے
پیش باطل از "نعم" برجا استے

توحید کے بعد ملت اسلامیہ کا دوسرا اصول رسالت ہے۔ اسلام نے
رسالت سے زندگی و قوت پائی ہے۔ رسالت توحید کی زینت اور
اس کی تفسیر ہے رسالت کا مقصد دنیا میں حریت کو عام کرنا اور انسانوں
کو اخوت کی تعلیم دیتا ہے۔ محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وعلیٰ آلہ واصحابہ وسلم

کا ظہور دنیا میں ایسے وقت میں ہوا جبکہ انسانیت ہر طرف جسمانی و ذہنی اور اخلاقی و روحانی غلامی کے طوق و بند سے جکڑی ہوئی تھی آپ ؐ نے تمام بند کاٹ کر اس کو سربلند کیا، حریت و اخوت کو عالمگیر بنایا اور ایک ایسی قوم پیدا کی جو ماسوا سے بیگانہ اور بلند اخلاق کا معیار و نمونہ تھی —— اس راز دار توحید اور یکسر امی نے وہ شریعت مرتب کی جو آج تک ہر قوم کے لئے ہدایت و رہبری کی شمع بن رہی ہے اور ہمیشہ بنی رہیگی !

حرفِ بے صوت اندریں عالم بدیم
از رسالت مصرع موزوں شدیم

عصرِ نو کایں صد چراغ آوردہ است
چشم در آغوش او وا کردہ است

نقشِ نو بر صفحۂ ہستی کشید
امتے گیتی کشائے آفرید

امتے از ماسوا بیگانہ !
بر چراغِ مصطفیٰ پروانہ

" کل مومن اخوۃ " اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش

تا شکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

قوم کے نظم و نسق کے لئے ایک لائحہ عمل اور قانون کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ بے آئینی جس قوم کا شعار ہو وہ بہت جلد فنا کے آغوش میں جا سوتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے آئین و دستور قرآن ہے

یہ ایک مکمل اور ابدی قانون ہے، جو زندگی کے ہر شعبہ میں ہدایت کرتا اور ہر زمانہ کا ساتھ دیسکتا ہے۔ اس کا نفاذ ہی قانون انسانیت کا نفاذ ہے۔

" لقد جاءکم من اللہ نور و کتاب

مبین یھدی بہ اللہ من اتبع

رضوانہ سبل السلام و یخرجھم

من الظلمٰت الی النور باذنہ و یھدیھم

الی صراط مستقیم " (مائدہ)

" بیشک اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور ہر بات کو کھول کر بیان کرنے والی کتاب آئی اللہ اس کے ذریعہ سے امن و سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے اور جو اس کے ذریعہ سے اس کی رضا چاہے اسے ہر طرح کی تاریکی سے نکال کر صراط مستقیم کی روشنی میں لے آتا ہے:۔ ؎

ملتے را رفت چوں آئیں ز دست

مثل خاک اجزائے او ہم شکست

ہستی مسلم از آئین است و بس

باطن دین نبی این است و بس

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟

زیر گردوں سر تمکین تو چیست؟

آں کتاب زندہ قرآن حکیم
حکمت او لایزال است و قدیم
تو اگر خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن

ہر متمدن قوم اپنے آئین وقانون کا بیحد احترام کرتی اور اس کی پابندی عین حیات جانتی ہے۔ کیونکہ ملت آئین سے ہی ہوتی ہے۔ اگر کسی قوم کے پاس کوئی دستور نہیں، یا وہ اپنے دستور کی تحقیر کرتی اور اس کی پابندی کو عار جانتی ہے تو اس پر مشکل ہی سے قوم کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ اور دنیا میں اس کو بجز شرم ورسوائی اور ذلت وپستی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے قومی کردار کی کمزوری اور ان کے زوال کا بڑا سبب یہ ہے کہ وہ اپنے آئین و شریعت کو نہ صرف بھلا بیٹھے بلکہ اس کے اتباع سے شرماتے ہیں اور ایک طبقہ ان میں ایسا بھی ہے، جو اس کو غیر اہم اور خرافات کا دفتر کہتا ہے، درآنحالیکہ ان کے پاس قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو دنیا کے تمام دستوروں سے زیادہ مکمل اور قابل فخر ہے، غیر مسلم محققین اس کو سراہتے ہیں اور تمام بڑے بڑے قوانین اس کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں کے قومی کردار وسیرت میں جو پختگی نہیں رہی اس کا باعث دستورِ شریعت کی بے حرمتی ہے۔ کیونکہ قوم کے کردار کو بنانے والا اور اس کی سیرت میں پختگی لانے والا اس کا دستور ہوا کرتا ہے۔ اسی واسطے شریعت کے نفاذ میں رحم ومروت کو دخل نہ دینے کی سخت تاکید کی گئی ہے، کیونکہ آئین و دستور کی سختی کے ساتھ پابندی و نفاذ قوم کی قوت میں اضافہ کرتا اور حیاتِ ملی کو گرم خون رکھتا ہے۔ اگر کسی مستحب یعنی قانونِ شریعت کی کسی غیر اہم دفعہ کی ادائگی

ونفاذ میں کوئی طاقت مزاحمت کرے تو اس وقت وہ مستحب ہی مسلمانوں کے لئے فرض عین بن جاتا ہے۔ مسلمانوں کو اسی لئے بار بار اور کھلے الفاظ میں تاکید کی گئی ہے کہ دیکھو اپنے اس قانون شریعت کو نہ ٹھکراؤ ورنہ تم ہر طرف سے ٹھکرا دیئے جاؤ گے:۔

"ومن یعص اللہ و رسولہٗ ویتعد
حدودہٗ یدخلہ ناراً خالداً فیھا
ولہٗ عذاب مھین" (نساء)

"جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرتا اور
اس کے قوانین کی خلاف ورزی کرتا ہے تو خدا اس کو
آتشین عذاب میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا
اور یہ اس کے لئے بہت ہی ذلیل کرنے والا دکھ ہے۔"

ملت از آئین حق گیرد نظام
از نظام محکمے خیزد دوام
چوں کسے گردد مزاحم بے سبب
با مسلماں در ادائے مستحب!
مستحب را فرض گردانیدہ اند
زندگی را عین قوت دیدہ اند

شرع می خواہد کہ چوں آئی بجنگ
شعلہ گردی در شگافی کام سنگ

از عمل آہن عصب سازد ت
جائے خوبے در جہاں انداز د ت
تا شعار مصطفیٰ از دست رفت
قوم را رمز بقا از دست رفت
آنکہ از تکبیر او سنگ آب گشت
از صفیر بلبلے بیتاب گشت:
آنکہ عزمش کوہ را کاہے شمرد
با توکل دست و پائے خود سپرد

جس طرح فرد اپنے مقصدِ حیات سے غافل ہو کر ذلیل و زندہ درگور ہو جاتا ہے، اسی طرح قوموں کا بھی ایک نصب العین ہوا کرتا ہے اور ان کی اجتماعیت اسی وقت تک مضبوط و قائم رہتی ہے، کہ وہ اپنے نصب العین سے غافل نہ ہوں قومی نصب العین سے غافل ہو جانا قوم کی موت ہے، ہر لحظہ و ہر آن نصب العین کو پیش نظر رکھنا چاہیئے اور تمام حرکت و عمل اسی ایک نقطہ کے گرد ہونا چاہیئے۔ کیونکہ ایک لمحہ کی غفلت ایک سو سال پیچھے ڈھکیل دیتی ہے۔ جب تک نصب العین سامنے رہتا ہے خون کی گرمی اور عمل کی چستی بڑھتی رہتی ہے عزم و یقین پختہ ہوتا ہے ہر قدم کامیابی کا قدم ہوتا ہے، دل میں تڑپتی ہوئی آرزوئیں اور مچلتی ہوئی امیدیں پرورش پاتی رہتی ہیں اور زندگی کو فروغ ہوتا ہے۔ اس لئے قومی نصب العین پست نہیں ہونا چاہیئے۔ نصب العین جتنا بلند و پاکیزہ ہوگا۔ حیاتِ ملی اتنا ہی عروج پائے گی۔ ملّتِ اسلامیۃ کا نصب العین حفظ و نشرِ توحید اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ یہ نصب العین بہت پاکیزہ اور بہت اعلیٰ ہے۔ اس کی حفاظت و صیانت اور نشر و اشاعت ہر مسلمان پر انفرادی و اجتماعی ہر حیثیت سے

فرض ہے۔ مسلمان کے معنیٰ بجز اس کے کچھ نہیں کہ ـــــــــــ ہر وقت توحید کا علمبردار رہے ؛ ـــــــــ اور ہر حالت میں اپنے قول و فعل اور ہر ممکن طریقے سے بھلائی کو پھیلائے اور برائی کو روکے۔ اس کی ہر جنبش اسی مقصد کے تابع ہو کہ اس سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں زیادہ سے زیادہ مخلوق کو فائدہ پہنچے۔

" کنتم خیر امتہ اخرجت للناس

تامرون بالمعروف وتنہون

عن المنکر وتومنون باللہ "

(آل عمران)

" تم بہترین امت ہو جو دنیا میں صرف اس لئے بھیجے گئے ہو کہ نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور خدائے واحد پر ایمان رکھتے ہو۔"

وہ مسلمان نہیں کہا جا سکتا جس کا یہ مقصد حیات نہ ہو، کیونکہ قرآن نے مسلمان کی پہچان ہی یہ بتلائی ہے۔

" الذین امکناھم فی الارض و

اقاموا الصلوٰۃ وآتوا الزکوٰۃ

وامروا بالمعروف و نھوعن

المنکر۔ (حج)

" یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ہم ان کو دنیا میں قائم کر دیں گے تو یہ نماز پڑھیں گے، زکوٰۃ دیں گے اور امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر ان کی دعوت ہوگی"

مدعا گردد اگر مہمیز ما
ہمچو صرصر می رود شبدیز ما

مدعا مضراب ساز ہمت است
مرکزے جاذب ہر قوت است

دست و پائے قوم را گرداند او
یک نظر صد چشم را گرداند او

تا نخیزد بانگ اذاں از عالمے
گر مسلمانی نیاسائی دمے

جلوۂ بر تاریکیٔ ایام کن
آنچہ بر تو کامل آمد عام کن

لرزم از شرم تو چوں روز شمار
پرسد آں آبروئے روزگار

حرف حق از حضرت ما بردۂ
پس چرا با دیگراں نسپردۂ

حیات قومی میں وسعت و دوام قوائے نظام عالم کی تسخیر سے آتا ہے کیونکہ اس سے حرکت مسلسل اور جہد پیہم کا عمل جاری رہتا ہے جس سے جذب و تسخیر کی قوت بڑھتی اور زندگی کو بقائے جاوید حاصل ہوتی ہے۔ قدرت کائنات کا نظام انسان ہی کی تسخیر و فتوحات کے لئے بنایا ہے خدا نے انسان کو سب پر فضیلت بخشی اور بتلایا کہ ڈرنے اور پوجنے کے لئے صرف اسی کی ذات واحد و مطلق ہے اور کائنات کی تمام اشیاء ابن آدم کی خدمت و چاکری کیلئے

ہیں زمین و آسمان پر خدا کے بعد انسان ہی کی حکومت ہے:۔

"الم تران اللہ سخر لکم ما فی السموٰت

وما فی الارض" (لقمان)

"کیا تم نہیں دیکھتے کہ آسمانوں اور زمینوں میں جتنی چیزیں

ہیں وہ سب اللہ نے تمہارے لئے مسخر اور تمہاری

خدمت کے لئے وقف کر دی ہیں"

یہ عظیم الشان دریا و سمندر ہماری ملکیت و قبضہ

میں ہیں"

"سخر لکم البحر لتجری الفلك فیه

بامرہ ولتبتغوا من فضله و

لعلکم تشکرون" (جاثیہ)

"تمہارے لئے دریا و سمندر کو مسخر کر دیا تا کہ

اس میں خدا کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تم اپنے

رزق کو تلاش کرو اور اس کے فضل و انعام

کا شکر کرو ـــــــ"

یہ کشتیاں اور جہاز اور تمام جانور ہمارے ہی فائدے

اور فرمانبرداری کے لئے ہیں:۔

"وجعل لکم من الفلك والانعام

ترکبون لتستو وعلیٰ ظہورہٖ ۔

ثم تذکروا نعمت ربکم اذا استویتم

علیہ وتقولوا سبحان الذی

سخر لنا ھٰذا ۔ (زخرف)

"کشتی اور جانور تمہارے لئے پیدا کئے ہیں، تاکہ تم ان
کی پیٹھ پر سیدھے سوار ہو، اور اپنے خدا کے احسان
کو یاد کرو اور کہو کہ پاک ہے وہ ذات جس نے ہمارے
لئے اس تمام مخلوق کو مسخر کر دیا۔"
یہ آگ ہمارے ڈرنے اور پوجنے کے لئے نہیں، بلکہ
زیر فرمان ہونے کے لئے ہے۔

" ھوالذی جعل لکم من الاخضر

ناراً ۔ (والصّٰفّٰت)

" وہ خدا ہی کی ذات ہے جس نے تمہارے لئے سبز
لکڑی میں آگ پیدا کی۔"
" یہ فلک فرسا پہاڑ ہماری عظمت وشان کے آگے
بہت ہی چھوٹے ہیں۔"

" انا سخرنا الجبال معہ یسبحن

بالعشی والاشراق ۔ (ص)

"ہم نے ان کے لئے پہاڑوں کو مسخر کر دیا تاکہ صبح و
شام وہ ہماری تسبیح کریں"

یہ چاند سورج اور ستارے ہمارے معبود اور ہماری تقدیر کے مالک
نہیں بلکہ ہم ان کے مالک و راز آشنا ہیں۔ اور یہ رات و دن ہماری خدمت
پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ ہم زمانہ کے تابع نہیں بلکہ زمانہ ہمارا تابع فرمان ہے:۔

" وسخر لکم الشمس والقمر دائبین
وسخر لکم اللیل والنہار "

(ابراہیم)

تمہارے لئے آفتاب و ماہتاب کو مسخر کر دیا جو حرکت
کرتے ہیں اور اسی طرح رات و دن اور ان کے خواص
و موثرات کو بھی تمہارا تابع فرمان بنا دیا "

ماسوا از بہر تسخیر است و بس
سینۂ او عرضۂ تیر است و بس

ہر کہ محسوسات را تسخیر کرد
عالمے از ذرۂ تعمیر کرد

تا ز تسخیر قوائے ایں نظام
ذو فنونیہائے تو گردد تمام

نائب حق در جہاں آدم شود
بر عناصر حکم او محکم شود

جستجو را محکم از تدبیر کن
انفس و آفاق را تسخیر کن
"علم اسما" اعتبار آدم است
حکمت اشیاء حصار آدم است

ملتِ اسلامیہ میں حسن وخوبصورتی آدابِ محمدیہ کی تقلید و پیروی سے آتی ہے۔ کیونکہ آپ خلق مجسم تھے، اور آپ کا وجود عالم کے لئے سراپا رحمت وبرکت تھا۔ انسان کی انفرادی واجتماعی زندگی میں آدابِ رسولؐ کی پیروی کے بغیر زینت نہیں آسکتی:۔

" لقد کان لکم فی رسول اللہ

اسوۃ حسنۃ " (ممتحنہ)

" بیشک تمہارے لئے رسول اللہ کے اسوۂ حیات میں ارتقاء انسانیت کا اعلیٰ ترین نمونہ پیش کیا گیا ہے "؛۔

غنچۂ از شاخسارِ مصطفیٰ
گل شو از بادِ بہارِ مصطفیٰ
از بہارش رنگ و بو باید گرفت
بہرۂ از خلق او باید گرفت
فطرتِ مسلم سراپا شفقت است
در جہاں دست و زبانش رحمت است

آنکہ مہتاب از انگشتش دونیم
رحمت او عام اخلاقش عظیم
طینت پاک مسلماں گوہر است
آب و آتش از یم پیغمبر است

جب کسی قوم پر انحطاط طاری ہو جائے تو اس کا علاج صرف یہ ہے کہ وہ اس زمانہ کو اپنے اسلاف کی سختی کے ساتھ پیروی کرتے ہوئے گذار دے اور ان ہی کے نقش قدم پر چلے۔ اس سے قومیت کا شیرازہ نہیں بکھرتا۔ اور ضبط ملی قائم رہتا ہے اور بہت جلد پستی وزوال کا دور ختم ہو کر اس پر رفعت و ترقی کی راہیں کھل جاتی ہیں۔ زمانۂ انحطاط میں اجتہاد نہ صرف یہ کہ سودمند نہیں ہوتا بلکہ تفرقہ ڈال کر اور زیادہ پستی و گمراہی کی گہرائی میں اتارتا رہتا ہے۔

آج تک یہودیوں کی قوم دنیا سے کیوں نہ مٹ گئی؟ حالانکہ موجودہ دستور وطنیت پر نہ تو ان کا کوئی خاص وطن ہے اور نہ ان سے زیادہ دنیا میں کوئی کمزور و ذلیل ہے۔ ہر قوم ان کی جانی دشمن ہے، ان کے پاس کوئی طاقت نہیں کہ وہ کسی حملہ کا دفاع کر سکیں۔ ان کا دینی مرکز بھی ان کے قبضہ میں نہیں۔ اور ان کا دین بھی کوئی ترقی یافتہ دین نہیں زمانہ کی سختیوں نے اس کی روح تک نکال دی۔ مگر اس کا دماغ اور ڈھانچہ اب تک قائم ہے۔ حوادث کے سینکڑوں طوفان و سیلاب اس کو فنا نہیں کر سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب سے ان پر قومی انحطاط طاری ہوا ہے وہ اجتہاد سے کنارہ کش ہو کر صرف تقلید و پیروی سلف کی رسی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہیں اور پرانے راستہ سے ایک قدم ادھر ادھر نہیں ہوتے۔

مسلمانوں کی شومیٔ نصیبی اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس وقت جبکہ وہ انحطاط و زوال کے گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں، دین پر سے انکی گرفت روز بروز ڈھیلی ہوتی جارہی ہے۔ مرکزِ ملی میں ان کے لئے وہ اہانہ جاذبیت و کشش نہیں رہی، ملت کے اصول و اساسی و نصب العین کو انھوں نے فراموش کردیا۔ آئینِ شریعت سے وہ روگرداں ہیں اور اتباعِ رسول کو غیر اہم سمجھ بیٹھے ہیں اور اب ہر قلم اجتہاد پر آمادہ اور ہر دماغ تجدید مذہب کے لئے سرگرم ہے:۔

"فاعتبروا یا اولی الابصار"۔

مضمحل گردد چو تقویمِ حیات
ملت از تقلید می گیرد ثبات

راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است
معنیٔ تقلید ضبطِ ملت است

بحر گم کردی زیاں اندیش باش
حافظِ جوئے کم آبِ خویش باش

پیکرت دارد اگر جانِ بصیر
عبرت از احوالِ اسرائیل گیر!

پنجۂ گردوں چو انگورش فشرد
یادگارِ موسیٰؑ و ہارونؑ نمرد

زانکہ چوں جمعیتش از ہم شکست
جز براہِ رفتگاں محمل نہ بست

اجتہاد اندر زمانِ انحطاط
قوم را برہم ہمی پیچد بساط
عقلِ آبایت ہوس فرسودہ نیست
کارِ پاکان از غرض آلودہ نیست
تنگ بر ما رہگذارِ دیں شد است
ہر لئیمے رازدارِ دیں شد است
از یک آئینی مسلماں زندہ است
پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو
ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو

تمت

خلاصۂ کلام:

حاصل اِس تمام بحث کا یہ ہے کہ ـــــــ زندگی اصل حقیقت ہے اور وہ قابل نفرت نہیں بلکہ لائق صد التفات ہے! اگر تم بدھ اور شوپنہار کی طرح آرزوئیں اور امیدیں ضرر رساں اور فضول نہیں بلکہ زندگی کے اِستحکام اور عمل کی گرمی و چستی کے لئے مفید تر ہیں۔ اور زندگی کے راستہ کی رکاوٹیں اور مصائب و آلام اس کی ترقی و دوام کے لئے اور سخت کوشی کی بیداری کے لئے بہت ضروری و سود مند ہیں۔ عقل پہ پورا پورا بھروسہ یا اس سے بالکل منہ موڑنا زندگی کے لئے نقصان رساں ہے، عقل کی تکمیل یہی ہے کہ وہ ادب خوردہ دل ہو، روحانیت و مادیت کے معتدلانہ اِمتزاج سے زندگی کا اَبدی چشمہ نکلتا ہے۔ زندگی کائنات کے لئے نہیں بلکہ کائنات کی تخلیق زندگی کے لئے ہوئی ہے اِس لئے اصل چیز حفظ زندگی و بیداریٔ حیات ہے۔ اور جو چیز زندگی پر دباؤ ڈالے اور اس کو فنا کرے وہ ادنیٰ اِلتفات کے لائق بھی نہیں۔ لہذا تمام علوم و فنون کا مقصد تابندگیٔ حیات ہونا چاہیئے ورنہ وہ مردود ہیں، معرفتِ ہستی یعنی خودی و خود شناسی، زندگی کی بہترین محافظ ہے اور زندگی پر جلا دیتی ہے۔

گلہائے عقیدت

کہاں ہے تو اے دانائے رموزِ حیات ــــــ؟ ابھی زندگی کے بہت سے عقدے تیرے ناخن کی گرہ کشائی کے منتظر ہیں ــــــ آ اور انھیں کھول! ــــــ اے عشق کے پرجوش مبلغ! ــــــ حسن کی طرح خود بینی و خود آرائی ابھی پورے شباب پر نہیں آئی ــــــ آ اور اس کی اشاعت کر! ــــــ کون کہتا ہے کہ تو مر گیا؟ ــــــ عاشقوں کو موت کب تک آتی ہے، تو زندۂ جاوید ہے ــــــ تیری اس ظاہری موت پر سینکڑوں زندگیاں نثار اور تیری اس لغزشِ پا پر ہزاروں ثابت قدمیاں صدقے! ــــــ تو سچا مسلمان تھا جس نے زندگی کے صحیح نصب العین کو سمجھا اور دوسروں کو سمجھایا! ــــــ مسلم کی موت "موت" نہیں بلکہ حیاتِ ابدی کا فتح باب ہے۔ مومن کے سامنے موت لرزتے ہوئے آتی اور جسم پر اس کا لمس مومن کے چہرہ پر شیفتگی اور لبوں پر تبسم دوڑا دیتا ہے۔

اے عالم بالا کے سبک سیر مسافر ــــــ! موت تیرے لئے نہیں، موت ان کے لئے ہے جو اس لئے جیتے اور سانس لیتے ہیں کہ دوسروں کا دم گھٹے ــــــ موت ان کو آتی ہے جو اپنا پیٹ بھرتے ہیں، تا دسر

دوسرے بھوک اور فاقہ سے جان دیں ——— موت اُن کے واسطے ہے
جن کے لباس کے تار و پود اور غذا کے لقمے مظلوم و بیکس اِنسانیت کے خون
سے تر ہیں ——— ماتم ہو ان چلتی پھرتی لاشوں پر جنہوں نے اے حیات
و ممات کے نباض! ——— تیرا پیغام نہیں سمجھا ——— اور تیری
پکار پر نہیں جاگے ——— صد فغان و حسرت ان کی زندگیوں پر جو
حشرات الارض کی طرح زندگی کا کوئی پاک و بلند مقصد نہیں رکھتے۔ یہ سانس
لیتے ہوئے مردے نہیں جانتے کہ جینا وہی جینا ہے، جو دوسروں کے
لئے بھی ہو، ورنہ شکمِ مادر سے لے کر آغوشِ لحد تک موت ہی موت اور
مر مر کر جینا ہے۔ تیرا تو نالہ و پکار ان مردہ روحوں کے متحرک مقبروں پر جو
اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر چیختے رہتے ہیں۔ اور جب نور
ہدایت ان کے سامنے لایا جائے تو ان کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا
ہو جاتی ہے اور وہ اس سے بے تحاشہ شور مچاتے ہوئے بھاگتے ہیں۔

سلام ہو تجھ پر! اے صحیفۂ حیات کے کامیاب مفسر

رحمت ہو تجھ پر! اے مخزنِ مشرق و فخرِ ایشیا!!

تو گلشنِ قدس کا ایک زمزمہ سنج طائرِ لاہوتی تھا، جو ہم صفیروں سے
جدا ہو کر ہمارے سینوں کو اپنی نوائے روح پرور سے گرمانے اور سوز
بخشنے اِس خلعتِ کائنات میں چلا آیا۔ اور اب پھر اسی چمن کی طرف پرواز
کر کے نخلِ طوبیٰ کی شاخوں پر بیٹھا ہوا فرشتوں اور حوروں کو اپنے الہامانہ
نغموں سے وجد میں لا رہا ہے۔

تیرا شبستان خاکی نور سے معمور رہے! اور شب و روز اس پر رحمتِ ایزدی کے پھول برسیں!!

مثلِ ایوانِ سحر مرقد فروزاں ہو ترا
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے
(بانگِ درا)

کتاب	مصنف	قیمت
چالیس کروڑ بھکاری	ابراہیم جلیس	۲—۱۲—۰
ٹکونا دیس	" "	۲—۱۲—۰
ہچکیاں	صدیقہ بیگم سیوہاروی	۳—۴—۰
سزا	قیسی رامپوری	۲—۴—۰
ضربیں	" "	۳—۰—۰
خطا	" "	۳—۰—۰
دھوپ	" "	۳—۴—۰
آج کل کے رومان	فضل حق قریشی	۲—۱۲—۰
قائدین کے خطوط جناح کے نام	سعید صدیقی	۲—۰—۰
نانسیت	شاہد رزاقی	۲—۱۲—۰
اسلام کے سیاسی تصورات	رشید	۲—۱۲—۰
داستان کربلا	سعید صدیقی	۲—۱۴—۰
تشنگی	اختر ندوی	۴—۰—۰
فکر اقبال	غلام دستگیر	۴—۰—۰
حکمت اقبال	" "	۴—۰—۰

روحِ اقبال	ڈاکٹر محمد یوسف حسین	۵—۱۲—۰
آثارِ اقبال	غلام دستگیر رشید	۳—۱۲—۰
مقامِ اقبال	اشفاق حسین	۳—۱۴—۰
مقامِ جمال الدین افغانی	رفعت	۲—۱۴—۰
مقالاتِ جمال الدین افغانی	مبارز الدین رفعت	۳—۴—۰
طوفان	رئیس احمد جعفری	۳—۶—۰
کوہِ نور کی سرگزشت	رہبر فاروقی	۱—۴—۰
ذکرِ جمیل	ماہر القادری	۱—۱۲—۰
فلسفۂ عجم	علامہ اقبال	۳—۲—۰
بچوں کی نفسیات	شیر محمد اختر	۱—۱۲—۰
نفسیاتِ زندگی	" "	۱—۱۲—۰
نثرِ ریاض	ریاض خیرآبادی	۲—۱۲—۰
جگر مرادآبادی	تبسم نظامی	۲—۰—۰
دل کی آگ	ظفر واسطی	۱—۸—۰
غبار	قیسی رامپوری	۲—۴—۰
نگینے	مظفر حسین شمیم	۲—۱۲—۰
تعبیریں	امین شرقپوری	۲—۱۴—۰
داستان اردو	نصیر حسین خیال	۱—۱۲—۰
ضیغم	سعیدہ مظہر	۱—۸—۰